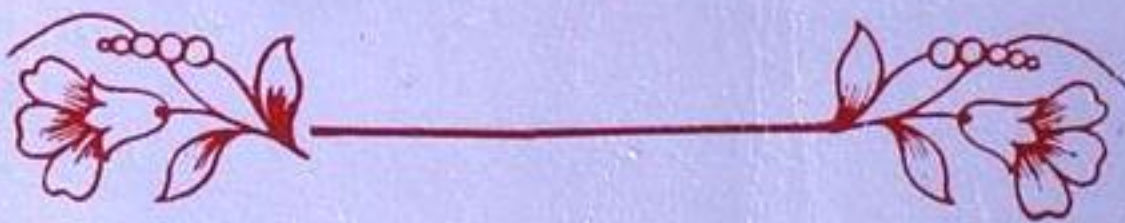


جمہوری دور میں

اسلام کی کامیاب رہنمائی



مولانا سید اخلاق حسین قاسمی

پیش کردہ :

افسی اسلام میسٹریز

افسی اینڈ برادرز (رجسٹرڈ) لال کنواں، دہلی ۶ فون: ۲۵۱۹۴۴۷

اسلامی (۹)

جمہوری دور میں

اسلام کی کامیاب رہنمائی

مولانا سید اخلاق حسین قاسمی

پیش کردہ :

افسی اسلامی اسٹیکرز

افسی اینڈ برادرین (رجسٹرڈ) لال کنواں، دہلی ۶ فون: ۲۵۱۹۲۲۷

قیمت ۱۹/۱۱ روپے



فہرست مضامین



صفحہ	مضامین	شمار
۳	صدائے درد -	۱
۱۸	دعوتِ اسلام کی پرامن جدوجہد اور اس کے اثرات -	۲
۲۸	جمہوری ہندوستان کی شرعی حیثیت، دالِ عہد تحریری معاہدہ اور عملی معاہدہ	۳
۳۶	حقوق کی جدوجہد، اصولِ استقامت کے مطابق -	۴
۴۴	اعتماد، اقلیت کا سرمایہ حیات -	۵
۵۰	یہ قتل کے فتوے؟ ارتداد بغاوت - رخصت کی فضیلت	۶
۵۶	بیوی کا قاتل، پاکستانی عدالت کا فیصلہ -	۷
۵۹	صوفیائے ہند پر غیر تاریخی الزام، الفرقان لکھنؤ میں -	۸
۷۲	ہندوستانی پر یوار کی تلاش، کیا ہندوستان کا انسانی ضمیر زندہ نہیں رہا؟	۹
۸۲	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت کے دو دور	۱۰
۹۰	پہلا دور اصول پسندی کا، دوسرا عملیت پسندی کا نیا دور قومی نہیں، انسانی ہے۔ مولانا وحید الدین خان صاحب	۱۱
۱۰۰	بصدا ادب مخاطب ہیں۔	۱۲
۱۰۷	ترکی عالم دین کا مشورہ، اہل پاکستان کو دعوت کا انداز بدلتا ہوگا جو مسئلہ بنایا گیا ہے وہ بے مسئلہ نہیں بن سکتا۔	۱۳
	مولانا وحید الدین خاں صاحب کا مشورہ نہ صرف اسلام کے خلاف ہے بلکہ ہندوستانی جمہوریت کو دنیا میں بدنام کرنے کی بھی تدبیر ہے	

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

● حفظ قرآن ۱۹۳۰ء

● عربی تعلیم تاجلالین شریف ۶۳۷ تا ۶۳۹
● تکمیل مشکوٰۃ شریف و بیضاوی شریف
● تادورۃ حدیث شریف ۶۴۰ تا ۶۴۱

● دورۃ تفسیر قرآن ۶۴۲

● تربیت ترجمہ و تفسیر قرآن ۶۴۲
● دوران تصنیف تفسیر کشف الرحمن

● آغاز درس تفسیر صباحی ۶۴۲

● دلی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے "فرقہ پرستی کی آگ"
نامی کتابچوں پر دفعہ ۱۵۳ ایف کے چار مقدمات قائم کیے
گئے جو (۶۷۸ تا ۶۹۸) بارہ سال تک چلتے رہے

● آغاز درس تفسیر شبینہ ۶۴۲

● سلسلہ وعظ و خطابت ۶۴۵

● تدریس و تعلیم حدیث و تفسیر مسجد حسین بخش دہلی

● صدارت جمعیتہ علماء صوبہ دہلی ۶۴۶

● نظامت جمعیتہ علماء ہند ۶۵۰

● درس تفسیر و اہتمام جامعہ رحیمہ شاہ ولی اللہ

● محدث دہلوی ۶۸۲ تا ۶۸۶

● درس تفسیر ہفتہ وار نومبر ۶۸۹

● تصنیفات و تالیفات

قاشرات حضرت مولانا محمد طیب صاحب
قدرت نے مولانا اخلاق حسین قاسمی کو تقریر و خطابت کے ساتھ
تحریر و انشائیہ کی مٹھوس صلاحیت سے بھی پوری طرح آواز دیا ہے،
موصوف علی تحقیق اور واعظانہ رنگ دونوں میدانوں کے
محمد طیب غفرلہ ۵ اپریل ۱۹۸۹ء
شہ سوہا میں،

قاری فضل الدین صاحب مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی
حافظ ضیاء الدین صاحب سادہ کار لال کنواں دہلی

مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی

دارالعلوم دیوبند، شیخ الحدیث مولانا سید حسین احمد صاحب
مدنی، مہتمم و استاذ حدیث مولانا محمد طیب صاحب

مولانا احمد علی صاحب لاہوری، انجمن خدام الدین لاہور
رفیق کار: مولانا عبید اللہ سندھی

سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب

مصنف تفسیر کشف الرحمن

لال مسجد لال کنواں دہلی، بافتتاح مولانا احمد سعید صاحب
مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی مولانا احمد علی صاحب
لاہوری

کھجور والی مسجد تراہا بہرام خاں، بافتتاح

مولانا حسین احمد صاحب مدنی و مولانا عبد الحنان صاحب لاہوری
آسودہ رحمت احاطہ مولانا سید احمد صاحب بریلوی بالاکوٹ

مدرسہ حسین بخش دہلی

(بعد از مولانا عبد الشکور صاحب

دیوبندی مہاجر مدنی)

بہدایت مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی

مسجد سید رفاعی حبلی قبر دہلی

علمی تاریخی اور تفسیری کتابیں تعداد ۲۰

تبلیغی کتابچے ۲۵

تحقیقی مقالات ۳۰





صدائے درد



فسراواں گنج غم در سینہ دارم اگرچہ مدعی گوید فقیرم

بابری مسجد کی شہادت کے بعد | بابری مسجد کی شہادت کے حادثہ نے اس

تحریک کی قیادت پر جو غیر تناک زوال طاری کیا اور وہ طاری ہونا ہی تھا۔ اس سے مسلمانوں کے اندر اس قدر مایوسی پھیلی کہ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم یتیم ہو گئے اور ہمارا کوئی سردھرا نہیں ہے۔

اغیار کی صفوں سے اس قسم کا تاثر پیدا کرنے کی منظم طور پر کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ اور اس تاثر کو اس بات سے بھی تقویت ملی ہے کہ دوران میں ہندوستان کی مسلم تنظیموں میں حد درجہ انتشار اور اضمحلال طاری ہوا ہے۔ ان حالات کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کو مایوسی سے نکال کر ایک واضح طرز عمل کی دعوت دی جائے جو اسلام کی معتدل حکیمانہ تعلیمات کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

اس سلسلہ میں جناب سید حامد صاحب کی قلمی جدوجہد میں دانشمندانہ عقلی رنگ تھا اور موصوف نے بڑے موثر انداز میں مسلمانوں کو سمجھانے کی دعوت دی، لیکن ملک میں پہلے سے پھیلے ہوئے دو متضاد نظریے مسلمانوں کے حق میں شدید قسم کی الجھنوں کا سبب بنے ہیں۔ اور اب بھی بنے ہوئے ہیں۔

حاکم یا اچھوت! | مسلمان پریشان ہے کہ مسلمانوں کے ان دو متضاد اور مخالف نظریات میں سے کونسے نظریہ کو صحیح

4
سمجھے! — ایک طرف تصویر پسند ا حیا فی طبقہ یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی حکومت اور الہی اقتدار قائم کرنے کی جدوجہد کرنی چاہئے، اسلامی اقتدار کے بغیر مسلمان زندہ نہیں رہ سکتا اور جو مسلمان اس جدوجہد سے الگ رہے گا وہ گناہ گار ہو گا۔

اس نظریہ کے ہندوستانی قائد مولانا مودودی صاحب کے اپنے اس تصور سے رجوع اختیار کرنے کے بعد جماعت اسلامی نے اپنے موقف میں تبدیلی کی مگر ایک طبقہ اس سے علیحدہ ہو کر اسی خیال تصویر پسندی پر قائم رہنا چاہتا ہے۔

دوسری طرف بالکل اس کی ضد ہے جو مولانا وحید الدین خان صاحب کے تصور کی صورت میں ملک کے سامنے آرہا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں بالکل بے مسئلہ بن کر رہنا چاہئے اور اپنے لئے مسٹر فرسٹ کے مقابلہ میں مسٹر نکسٹ کی پوزیشن اختیار کر لینی چاہئے۔

ایک آواز اٹھتی ہے کہ اسلامی معاشرہ اسلامی اقتدار کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا، اس پر سوال کیا جاتا ہے کہ اسلامی اقتدار کیسے قائم ہو۔؟ — جواب ظاہر ہے کہ اسلامی اقتدار مسلم معاشرہ ہی قائم کر سکتا ہے — کافر معاشرہ سے یہ توقع نہیں کی

جاسکتی ہے اور نہ فاسق و فاجر معاشرہ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے۔ تو یہ ایسی ہی بات ہو گئی کہ مرعنی پہلے یا انڈیا پہلے — اس کا جواب واضح ہے کہ مرعنی پہلے ہے جو انڈیہ کے بغیر خالق کائنات کا اپنی مخلوق کے لئے ایک انعام ہے جو اس کی قدرت کمن کی کون سے ظہور میں آیا۔

ایک مسلم اخبار کے ایڈیٹر صاحب کا یہ تکیہ کلام تھا کہ مچھلی اپنے پانی میں زندہ رہتی ہے میں نے ان سے سوال کیا کہ جو مچھلیاں اپنے پانی (حکومت بغداد، دمشق و ایران) سے نکل کر افریقہ کے صحراؤں اور شرق الہند کے

جزیروں میں داخل ہوئیں اور پھر خوب پھلی پھولیں اور ان مخالف پانیوں کو
 بغیر تلوار کے اپنے رنگ میں رنگ لیا وہ کیسے ہوا۔ ؟
 تو اس کا جواب ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

علامہ اقبال اور پاکستان

پاکستان میں آج کل علامہ اقبال کے بارے میں بڑی دل چسپ بحث چل
 رہی ہے، میں نے وہ پوری بحث تو الگ مضمون میں پیش کی ہے، خلاصہ اس کا
 یہ ہے کہ جس فاضل مہنتی کو مفکر پاکستان اور بانی پاکستان قرار دیا جا رہا ہے
 وہ اپنی تحریروں میں صاف صاف کہہ رہا ہے کہ میں ہندوستان کی تقسیم
 نہیں چاہتا۔ تقسیم کا نظریہ تو لندن میں بنایا گیا اور اسے جناح صاحب
 لے اڑے۔

اقبال کے ان دستاویزی خطوط کو چھاپ کر اقبال کے سب سے
 بڑے مداح ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو مجبوراً یہ کہنا پڑا۔
 ”علامہ کی شاعرانہ عظمت کا یہ اہم پہلو ہے کہ ایک جانب بلند ترین
 ”تصور پسندی“ کی بلند پروازی بلکہ گردوں پیمائی ہے اور دوسری طرف
 ٹھوس زمینی حقائق پر مبنی واقعیت پسندی ہے، چنانچہ وہ ایک طرف
 مسلمانانِ عالم کی وحدت ملی کے حدیٰ خواں ہیں اور دوسری طرف
 اپنے خطبوں میں یہ فرماتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں فی الواقع کوئی ایک
 امت مسلمہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے بلکہ بہت سی مسلمان اقوام ہیں
 اور اگر دستِ ان مسلمان اقوام کی کوئی دولت مشترکہ ہی وجود میں آئے
 تو یہ بھی بڑی بات ہوگی۔ (میشاق لاہور، ۳ اگست ۱۹۴۷ء)

غور کیجئے! ایک بالکمال شاعر کی شاعرانہ فن کاری پر کس طرح اس

سادہ لوح مسلم قوم کو بچایا گیا؟ — اور جب بربادی مکمل ہو گئی تو اب سمجھ میں آیا
کہ وہ تو ایک شاعر کی شاعری تھی — کبھی لاہوتی، کبھی ناسوتی،

گھلتا نہیں مرے سفر زندگی کا راز لاؤں کہاں سے بندہ صبا نظر کو میں
جاتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہ رو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

قرآن کریم نے کتنی حقیقت افروز بات کہی ہے۔ والشعراء يتبعهم الغاؤون (شعراء)^{۲۳۵}
شاعروں کی پیروی کرنے والے وہی لوگ ہیں جو خود بھکے ہوتے ہیں اور حضرات
انبیاء کی اتباع وہ لوگ کرتے ہیں جو قلبِ سلیم کے مالک بنائے گئے ہیں

مستر جناح کا پاکستان قومی وطن تھا!

اس کے ساتھ پاکستان کے سیاسی رہنما اور علامہ اقبال کے صاحبزادے
جاوید اقبال صاحب پوری شدت سے یہ آواز اٹھا رہے ہیں کہ مسٹر جناح
اور اقبال کا پاکستان اقبال کی طرف نسبت اگر صحیح ہے، ایک قومی وطن
اور ہندو مسلمان سب کے مشترکہ ملک کے طور پر وجود میں آیا ہے۔ پاکستان
ایک مذہبی ریاست کے طور پر وجود میں نہیں آیا۔

اور یہ آواز اس مذہبی جارحیت و جہاد کا ردِ عمل ہے جو دیوبندی، بریلوی
سنی اور شیعہ، سنی اور احمدی، مسلم اور عیسائی کے درمیان خوں ریز
تصادم کی خوفناک صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

اور اس مذہبی اور علاقائی خانہ جنگی میں جہاں اہل مذہب کی حد سے
تجاوز مسلکی عقیدت کا دخل ہے وہاں حکمران طبقہ کی سازشیں بھی شامل ہیں۔

خداوند! یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری

پاکستان سازش یا خدائی معجزہ!

پاکستان اس وقت اندرونی مذہبی اور علاقائی استہزی اور کشمیر کے مسئلہ میں جینوا کے اندر ناکامی کے سبب اس بحث سے دوچار ہے کہ پاکستان برطانوی سازش کا نتیجہ ہے جو مسلمانانِ عالم کے خلاف اس برطانوی استعمار کا آخری کاری وارتھا جو ایشیا سے مجبوراً پسپائی اختیار کر رہا تھا اور نہ صرف یہ کہ مسلم لیگ انگریزوں کا خود کاشتہ پودا تھی بلکہ اس کی قیادت غیر شعوری ہی نہیں، شعوری طور پر انگریزوں کی ایجنٹ اور برطانوی استعمار کی آلہ کار تھی۔

اسی کے جواب میں مذہبی قیادت یہ کہہ رہی ہے کہ پاکستان کا وجود خدائی معجزہ اور تقدیری فیصلہ تھا“
(میشاق، لاہور ۳ اگست ۱۹۴۷ء)

آشفۃ خاطر ی بھی عجب شئی ہے شیفتہ

طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

اس خواب کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر اسبابِ پاکستان کے وجود میں آنے کے معقول محرکات نہیں تھے، کسی سیاسی دلیل سے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ ملتِ اسلامیہ ہند کے مسائل کا حل پاکستان کا قیام تھا۔ ایک غیر عقلی واقعہ — سازش تھا — یا تقدیر الہی۔

آزاد اور مدنی کی قیادت!

اس افسردہ و تفریط میں جماعتِ شیخ الہند (آزاد، مدنی گروہ) نے بیرونی لہروں سے بچ کر اسلام کی اعتدال پسندانہ رہنمائی کے مطابق مسلمانوں کو چلانے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دی کہ

ہندوستان کو متحد رکھ کر ہندو مسلمان اور سکھ عیسائی برادرانہ زندگی کا آغاز کریں اور ایک جمہوری ملک کی داغ بیل ڈالیں۔

ہندو مسلمانوں کے ایک ساتھ رہنے میں فی الحال مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں اور تاریخ نے جو تلخیاں چھوڑی ہیں اس کے اثرات دیر تک رہ سکتے ہیں لیکن ان مشکلات پر آمستہ آمستہ قابو پایا جاسکتا ہے اور بہر حال مسلمانوں کو دو حصوں (بلکہ تین حصوں) میں تقسیم کرنے سے جو مشکلات پیدا ہوں گی وہ حل کر رہنے کی پریشانیوں سے ہزار درجہ زیادہ ہوں گی اور ان پریشانیوں کا کوئی انت نہی ہو گا۔

ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میر
زمین و زماں ہر زماں اور ہے

پاکستان میں مذہبی حکومت!

مسلم اکثریت کا ملک ہونے کے باوجود اور مذہبی طبقوں کی مسلسل نعرہ بازی کے باوجود پاکستان میں قرآن و سنت کی خالص فرماں روائی قائم نہیں ہو سکی۔ پھر ہندوستان میں مذہبی اسٹیٹ کے معنی ہندو اکثریت کا ہندو راشٹر ہی ہو سکتا ہے۔ حکومت الہیہ تو ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ حکومت سازی و ڈنگ سے ہوتی ہے۔

کیا دنیا کی کوئی اقلیت جہاد بالسیف کے ذریعہ اپنی مذہبی اسٹیٹ قائم کر سکتی ہے۔ سکھوں کا خالصستان اتنی بربادی کے بعد بھی نہیں بن سکا۔ کشمیر کو دارالسلام بنانے کے لئے مجاہدین بیرونی ہتھیاروں سے کیا کچھ کر رہے ہیں۔؟ کیا یہ ہو سکے گا، سوال عالم اسباب کا ہے، آسمانی معجزہ کا نہیں ہے،

ایک نے صورت نہ پکڑی پیش یار + دل میں شکلیں سینکڑوں ٹھہرائیاں

پاکستان سے ہمارا رشتہ!

ہمارے بزرگ علماء کہا کرتے تھے کہ یا تو پاکستان بنتا نہیں، اب جب
 مشیتِ الہی یہی تھی تو اب پاکستان کی خوشحالی اور اس کی ترقی ہماری خواہش
 ہے، فرقہ پرست کہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں، یہ
 بات صحیح ہے پاکستان سے ہمارا خون کا رشتہ ہے، جس رشتہ پر چھری نہیں
 چلائی جاسکتی۔ لیکن پاکستان کا یہ اخلاقی اور دینی فریضہ ہے کہ وہ صرف
 اپنے سیاسی مسائل پر ہی نظر نہ رکھے، اس کا خیال بھی رکھے کہ ہمارے
 بیس کروڑ مسلمان بھائی (جو انڈونیشیا کے بعد سب سے بڑی مسلم آبادی
 ہے) ہندوستان میں بستے ہیں، ان بھائیوں کو اپنے اندرونی مسائل
 اور بیرونی سازشوں سے متاثر ہو کر طرح طرح کی الجھنوں میں مبتلا کرنا ایک
 غیر اخلاقی فعل ہے۔

پاکستان ہماری ہمدردی میں سیاسی آواز بلند نہ کرے، اس سے
 ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہونچتا بلکہ ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات
 خوشگوار بنائے، اس سے ہمیں فائدہ حاصل ہوگا۔
 کشمیر چند لاکھ مسلمانوں کی آبادی کا ایک چھوٹا سا علاقہ ہے اور
 پاکستان کے مذہبی بھائی اور خونی رشتہ دار باقی ہندوستان میں
 بیس کروڑ ہیں۔

پاکستان کی لیڈر شپ اس معاملہ کو سطحی معاملہ نہ سمجھے، بلکہ خدائے
 اس قیادت سے آخرت میں باز پرس کرے گا اس سے زیادہ ہم
 ہندوستانی کچھ نہیں کہہ سکتے۔

مجنوں سے میں نے پوچھا کل حال بے خودی کا
 کچھ کہہ سکا نہ منہ سے، پر زار زار رو یا

پیش نظر مضامین میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام موجودہ جمہوری دور کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کو سنجیدہ اور مثبت رول ادا کرنے کی کتنی واضح ہدایات دیتا ہے اور حریت پسند علماء کی جماعت کے سامنے اسلام کی یہی واضح اور معتدل حکیمانہ تعلیمات تھیں اور ہیں۔

کمزور طبقوں کا ابھارا!

ہندوستانی جمہوریت جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے ملک کے پسماندہ طبقے ابھر رہے ہیں اور اتر پردیش جیسے صوبہ میں مسلمانوں اور پچھڑی جایتوں کا سیاسی اتحاد ملک میں ایک بڑے سماجی انقلاب کا پیغام دے رہا ہے۔

اس انقلاب کو قوت پہنچانے کے لئے بھی اسلام کی جمہوری سماجی اور معاشرتی تعلیمات وقت کی ضرورت بن چکی ہیں اور مسلمان کسی مفاد کے تحت نہیں بلکہ اسلامی ہدایات کے تحت مساوات اور انسانی عزت و آزادی کے اصولوں پر چلنے کا پابند ہے۔

کمزور طبقوں کی جدوجہد کا ساتھ دینا کسی سیاسی غرض سے نہیں بلکہ انسانی احترام کے اصولوں کے مطابق مذہبی ذمہ داری پوری کرنے کی غرض سے منہ بھرنی چاہیے۔ یہ تقاضا ہے اسلام کا۔ اسی میں دنیوی مفاد بھی پوشیدہ ہے۔

بعض تصور پسند مسلمان جب مذہبی سیاست کے انداز کی باتیں کرتے ہیں تو ہندو راشٹر کا حامی گزرجن طبقہ اس آنے والے سماجی انقلاب کی جدوجہد کو کمزور کر دیتا ہے۔ اور پسماندہ طبقہ کو مسلمانوں کے عزائم سے خوف زدہ کر کے انہیں مسلمانوں سے دور کر دیتا ہے۔

اسی طرح مسلم مسائل کے لئے اشتعال انگیز احتجاج سے پس ماندہ

طبقہ گہرا جاتے ہیں اور مسلم اقتدار کے دور کی جاگیر دارانہ ذلت آمیز روایتیں ان کے سامنے آ جاتی ہیں،

اس لئے ملک کے حالات کی جدید کروٹ کا بھی یہ شدید تقاضا ہے کہ مسلمان پورے شرح صدر کسی جمہوری کے تحت نہیں (ہندوستان کی جمہوری زندگی میں شریک ہوں)۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب تک شریک نہیں تھے، مسلمانوں کی اکثریت اہل تجارت، محنت کش، اہل زراعت اور تعلیم یافتہ لوگ (کھوڑے بہت ہی سہی) آزادی کے بعد سے ہی ہندوستان کی تیز و ترقی میں سرگرم عمل ہیں۔ میرا اشارہ اس طبقہ کی طرف ہے جو ابھی تک تذبذب کا شکار ہے، ہچکچاہٹ میں مبتلا ہے اور یہ طبقہ محدود دسہی مگر پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے مسلمانوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

چمن میں تلخ نوائی میسری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

قیامت خیز دور کی رہنمائی!

میں خاں صاحب کے فلسفہ پیاپی اور احیاءِ پسندوں کے بے وقوفہ جوش و خروش اور شدت پسندانہ نظریات کو دیکھ کر جب ۴۷ء کے قیامت خیز طوفان کے مولناک مناظر کا تصور کرتا ہوں تو مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ان حالات میں علماء حق کی قیادت اگر خاں صاحب کی طرح دہشت و وحشت میں گرفتار ہو جاتی تو قوم ارتداد کی زوبان آ جاتی اور اگر تحریک پاکستان کا جوش و خروش اور تحریک اسلامی کا طاغوتی فلسفہ ان حضرات پر مسلط ہو جاتا تو مسلمانوں کے اکھڑے قدم جنے مشکل ہو جاتے۔

وہ تو ان علماء حق نے صحیح دینی رہنمائی کے مطابق اعتدال، حکمت نبوی اور حضرات صوفیاء کبار کے روحانی مشن پر چل کر آگ اگلے طوفان کو صبر و تحمل اخلاق و خدمت اور دعائے نیم شبی سے ٹھنڈا کرنے کے لئے سردھڑکی بازی لگا دی۔

باطن میں ابھر کر ضبط فغاں لے اپنی نظر سے کار زباں
دل جوش میں لا، فریاد نہ کر تاثیر دکھا، تقریر نہ کر

ومشت طاری ہونے کی مثال!

اس وقت ایسی مثالیں بھی قائم ہوئیں کہ ایک مشہور صاحبِ علم اور صاحبِ قلم بزرگ نے خوف کی وجہ سے اپنی ڈاڑھی منڈوا دی جب قزولباغ دلی کے خوفناک فساد نے مولانا حفظ الرحمن صاحب کے علمی ادارہ ندوۃ المصنفین کو گھیر لیا تو وہ بزرگ اپنا حلیہ بدل کر اس طوفان سے نکلے اور اس کے بعد بھی وہ عرصہ تک اسی حالت میں رہے۔

مولانا حسین احمد مدنی کی سخت تربیت!

اس کے برعکس مولانا حسین احمد مدنیؒ نے باوجود اپنی مشہور مشفقانہ روحانی تربیت کے ڈاڑھی کے معاملہ میں سخت رویہ اختیار کر لیا۔ یہ دور مولانا کی شخصی مقبولیت اور مرجعیت کے انتہائی عروج کا تھا۔ اور مسلمان مولانا علیہ الرحمہ کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے کے لئے حقوق درجوق ہر طرف سے چلے آ رہے تھے اور مولانا بیعت کرنے کے لئے یہ شرط لگاتے تھے کہ ڈاڑھی رکھ کر آؤ، تب میں بیعت کروں گا۔ اس طرح سینکڑوں مسلمانوں کے اندر اپنے دینی شخص کے ساتھ پوری جرات سے زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

مولانا احمد سعید کی ہدایت!

میں عشاء کی نماز کے بعد مسجد کھجور والی تہرا با بہرام خاں میں تفسیر قرآن بیان کرتا تھا اور اس درس کا افتتاح مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور مولانا عبد الحنان صاحب ہزاروی (آسودہ رحمت احاطہ مزار حضرت سید احمد شہید بریلوی بالا کوٹ پاکستان) نے کیا تھا، جس کی وجہ سے اس مجلس کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ ۴۷ء کے ہنگامہ کی وجہ سے یہ مجلس بند ہو گئی۔ حالات جب کچھ بدھرے تو مولانا احمد سعید صاحب نے مجھ سے فرمایا، مولوی صاحب! ترجمہ کیوں شروع نہیں کرتے؟ لوگ گھروں سے نکلیں گے، خدا کے ذکر سے ان کے حوصلہ بلند ہوں گے پھر سرسید مرحوم کے بارے میں کہا کہ لوگ علماء کے حوالہ سے سرسید کو کیا کچھ کہتے ہیں لیکن ہم تو سرسید کو ان کی اس رباعی میں دیکھتے ہیں اور اسی رباعی میں سمجھتے ہیں بظاہر

بھلی لگتی ہیں باتیں مصطفیٰ کی
کہانی ہے بڑی اور رات چھوٹی

مزا آتا ہے باتوں میں خدا کی
ہوئی باتوں میں منزل مفت کھوٹی

میں نے عرض کیا کہ مولانا مجھے لال کنویں سے آنا اور لال کنواں جانا ہو گا۔
فرمایا، مولوی صاحب! تم خلیفہ جی کے لڑکے ہو کر ڈرتے ہو۔

آکا شرف الدین (میر والد کے ماموں جنہوں نے لا ولد ہونے کی وجہ سے مجھے گود لے لیا تھا) دہلی کے بڑے کارخانہ داروں میں شمار کئے جاتے تھے، کاہانی کا کام تھا، جسمانی ورزش کا بھی شوق تھا اور خلیفہ جی کر کے مشہور تھے۔ پھر مولانا کے حکم سے میں نے تفسیر شروع کر دی۔

نوٹ: میرے والد مرحوم کا نام میر عنایت حسین ولد علی حسن سکونت چھتہ جانتا ر خاں باغ دیوار دہلی اور میری والدہ کا نام سیدہ جہاں آرا بیگم بنت سید ذوالبالی مرحوم جوہری کٹرہہ شیخ چاند لال کنواں دہلی۔

۹
اسلام آباد

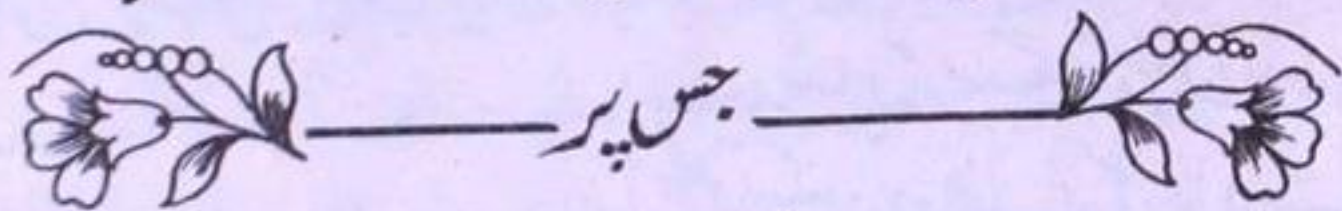
ایک روز میں چاوڑی بازار کی گلی مرغان (گلی بجہ رنگ بلی) کے سامنے سے گزر رہا تھا، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی، برسات کا اندھیرا تھا کہ اس گلی میں سے نکل کر کسی شرارت پسند نے تیچھے سے میسر چڑا اس ماری اور مجھے گرا ناچا ہا، یہ گلی مشہور تھی، خدا جانے کتنے راہ گیر اس گلی کا نشانہ بنے، لیکن خدا نے خیر کی اور میں گرتے گرتے سمجھلا اور دفتر جمعیتہ علماء میں مولانا حفظ الرحمن صاحب کو واقعہ سنایا۔ مولانا نے پولیس افسران سے شکایت کر کے چاوڑی بازار میں پولیس کا گشت بڑھوایا۔

مولانا احمد سعید صاحب کے علم میں یہ واقعہ آیا، مرحوم نے مجھے بلوایا اور فرمایا۔ اس واقعہ سے گھبرانا نہیں، ہمیں قربانیاں دے کر ہندوستان میں مسلمانوں کو جمانا ہے۔

عاجزانہ درخواست!

یہ بات یہ عاجز پورے خلوص کے ساتھ عرض کر رہا ہے کہ مسلمانوں کے جذباتی طبقہ جو ملک اور قوم کے ساتھ مثبت اور تعمیری ذہن پیدا کرنے سے معذور ہے اس کا یہ سوچنا کہ وہ مسلم قیادت کی خلا کو تر کر کے ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت کا فرض ادا کرے گا۔ انتہائی نا عاقبت اندیشی کی بات ہے، حالانکہ ملک کے اکثریتی فرقہ کے ایک طبقہ کی (جس میں حکمران اور اپوزیشن دونوں کے افراد شامل ہیں) یہ خواہش اور کوشش ہے کہ مسلمانوں کا جذباتی گروہ مسلم قیادت کے منصب پر آجائے (جیسا کہ بابر میسج تحریک میں تھا) جو اپنی فکری شدت کی وجہ سے غیر مسلم جمہوریت پسندوں کی صف میں اپنی جگہ نہ بنا سکے اور مسلمانوں کی چیخ پکار ملک کے اندر صدابھرا رہے۔ کیونکہ اگر قومی اور جمہور ذہن و طرف رکھنے والے افراد دوبارہ قیادت پر آگئے (جنہیں بڑی مشکل سے ایک حکمران طبقہ کی سازشوں نے اور جذباتی لیڈر شپ نے پیچھے ہٹایا تھا اور پہلی صف کے مذہبی اور

دعوتِ اسلام کی پُر امن جدوجہد



دوستوں اور دشمنوں دونوں پر دھڑلے کی منظم سازش کی ہیں

غیر مسلم مورخین کو چھوڑ دیجئے، مسلم مورخین کو لیجئے، جن کی ذمہ داری تھی کہ وہ دنیا کے غیر مسلم ملکوں میں اسلام کی حقیقی قوت (دعوت و تبلیغ) کے ذریعہ اس کے پھیلنے کی تاریخ لکھتے، لیکن مسلم اقتدار کی توسیع اور پھیلاؤ کے واقعات کی تاریخ لکھنے پر چونکہ اصحابِ حکومت کی طرف سے انعام و اکرام ملتا تھا اس لئے لڑائیوں کے واقعات کو بڑھا چڑھا کر ان سے تاریخیں لکھی گئیں۔

مبالغہ کے ساتھ فوجوں کے جوش و خروش کے فرضی مظاہرے مرتب کئے گئے۔ اس مبالغہ انگیز تاریخ نویسی کا مقصد فوجیوں کے اندر مزید جوش و خروش پیدا کرنا تھا یا حصول مفادات پیش نظر تھا، جو صورت بھی ہو، بہر حال وہ ایک دنیوی غرض تھی، اس انداز تحریر سے اسلام کی پُر امن اشاعت کی عظیم تاریخ پر پردہ پڑ گیا اور اسلام کے دعوتی مشن کو نقصان پہنچا۔

تھامس نے پریچینگ آف اسلام میں اسلام کی اشاعت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور نیک دل حکمرانوں دیانت دار اور سچے تاجروں اور غلوں عزت کشوں کے ذریعے نہایت خاموشی کے ساتھ توحید و رسالت کی روشنی پھیلنے کے واقعات مرتب کئے ہیں۔

حضرات صوفیاء کی کتابوں میں حضرت شیخ المشائخ سلطان محبوب الہی کے ملفوظات
فوائد الفواد ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے اس پہلو کی واضح تصویر پیش
کرتے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمہ کے یہ مستند ملفوظات نہ صرف مشائخ چشت کا دستور العمل
ہیں بلکہ غیر مسلم ملکوں اور غیر مسلم حلقوں میں تبلیغ و دعوت اور اصلاح معاشرہ کا
مسنون و ماثور طریق کار بھی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاموش مبلغ نہ تو رسمی طور پر کوئی جلسہ کرتے تھے،
نہ بستیوں میں گشت لگاتے تھے نہ کسی قسم کا تحریری پروپیگنڈہ کرتے تھے بلکہ اسلام
نے بنیادی تعلیمات کے طور پر ان کے اندر انسانی احترام کا جو تصور پیدا کر دیا تھا
وہ ان کی اصلی قوت تھی۔ انسانی احترام اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اس عقیدہ کو
تقویت دینے کے لئے اسلام نے حق انسانیت کے ساتھ دو بنیادی تصور مزید
پیدا کئے۔

ایک ہرم نشین اور سماجی رفیق کے لئے پڑوسی (حق جوار) کا تصور جبکہ اسلام
سے پہلے صرف دیوار بیچ رہنے والے کے لئے پڑوسی کا تصور تھا۔
دوسرا تصور سماجی اعتماد اور شہری تعلق کے لئے علی معاہدہ امن و صلح
(عملی عہد) کا تصور۔

یہ اصول زندگی بھی اسلام کی دین ہے اور اسلام کے جمہوری مزاج اور
انسان دوستی کی نہایت اہم بنیاد ہے۔

یہ تین تصورات تین عقیدہ اور تین بنیادی اصول ایسے ہیں جو غیر مسلم ملکوں اور
سیکولر سماج میں اسلام کی رہنمائی کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کراتے ہیں
خوش عقیدہ اہل قلم مسلمانوں نے عملی دعوت اور تاجروں کے اخلاقی اثر کو فوق العاد
کرامات کا رنگ دے دیا ہے اور اس غلط رنگ آمیزی سے اسلام کی اخلاقی عظمت
پر پردہ پڑ گیا ہے۔

سیاست پسند مسلم رہنماؤں نے اسلام اور مسلمانوں پر یہ ظلم ڈھایا ہے

کہ سیاسی اقتدار کے حصول اور حکمرانی کرنے کے شوق اور جذبہ کو اسلام کا حقیقی نصب العین قرار دیا اور اس جذبہ کو مسلمانوں کی اصلی قوت بنا کر پیش کیا ہے۔ ان سیاست پسندوں نے اس مفروضہ کو اس قدر شہرت دے دی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں جاتے تھے وہ جوشِ جہاد اور مالِ غنیمت کی طبع اور عرب کے ریگزاروں سے بجات پاکر عجم (شام و فارس) کے عشرت کدوؤں میں دادِ عیش دینے کی غرض سے جایا کرتے تھے۔ اسی مکتب فکر کے اہل قلم (تحقیقات اسلامی علی گڑھ) کے خیال میں سر تھا مس ارنلڈ کی کتاب پر پتہ چنگ آف اسلام برطانوی حکومت کی ڈپلومیسی کے تحت لکھی گئی تاکہ مسلمانوں کے اندر سے جوشِ جہاد ختم کر دیا جائے۔

تھامس نے یہ کتاب سر سید مرحوم کے مشورہ سے مرتب کی۔ سید مرحوم یہ چاہتے تھے کہ اسلام کی اشاعت کا دعوتی پہلو بھی دنیا کے سامنے آئے اب تک اسی خیال کا غلبہ رہا کہ دنیا میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، تھامس نے زور و زبردستی کے واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اور دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ واضح رہے کہ حقِ حکمرانی اور حقِ آزادی دو الگ الگ باتیں ہیں۔ اسلام آزادی کو ہر فرد اور ہر قوم کا فطری حق تسلیم کرتا ہے اور جہاں مختلف طبقے اور مختلف قومیں آباد ہوں وہاں ان سب آزاد قوموں کو برادرانہ طریقہ پر رہنے کا سلیقہ سکھانا ہے۔ حقِ حکمرانی کو قرآن کریم ممالک الملک کی مصلحت عامہ سے وابستہ کرتا ہے۔ سیاست پسندوں نے اپنا پرو پگنڈہ اس شدت اور جوش کے ساتھ کیا کہ ان خاموش داعیانِ اسلام اور اپنے عملی اخلاق اور انسانیت دوستی کے طرزِ عمل سے اسلام کی عقیدت و محبت پھیلانے والوں کی کوششیں موزیں اور اہل قلم کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان تاجرانے اپنے اپنے راحت کدوؤں کو چھوڑ کر چین، افریقہ، جزائر شرق الہند

میشیا و انڈونیشیا اور جنوبی ہندوستان پہنچے، چنانچہ آج ان ملکوں میں مسلمانوں کی موجودگی ناسخ حکمرانوں کی ممنون احسان نہیں ہے بلکہ ان سوداگروں کی ممنون احسان ہے جو اسلامی اخلاق کی سچی تصویر بن کر اسلامی صداقت کے روشن مینار ثابت ہوئے ان کے دل میں یہ یقین تھا کہ ہر انسان قابل احترام ہے، انسان کی فطرت خیر پسند اور صلح پسند ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ (پنی اسرائیل)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَن تَقْوِيمٍ (الین ۴)

ان سوداگروں کو اپنے ماں باپ سے اور اپنے استادوں سے قرآن کریم کی یہ تعلیم ملی تھی کہ ہر انسان جس سے تھوڑی دیر کے لئے بھی کسی مقصد کے تحت واسطہ پڑے اسے پُروسی کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور اس کی جان اور اس کا مال اپنی جان اور اپنے مال کی طرح واجب الاحترام قرار پاتا ہے۔

والمجاردی القرابی و المجاری الجنب و الصاحب بالجنب (نساء ۲۶)

وہ تجارت کے لئے نکلنے والے سوداگروں کے روپ میں داعی الی اللہ تھے، انہیں بتایا اور سمجھایا گیا تھا کہ جس بستی اور جس محلہ میں مسلمان جا کر لین دین کرتا ہے اور وہاں کے بسنے والے غیر مسلم اس کے ساتھ اعتماد اور بھروسہ کا اظہار کرتے ہیں تو یہ تعاون عملی معاہدہ ہے اور جس طرح ایک مسلم حکومت کسی غیر مسلم طبقہ سے تحریری صلح کرتی ہے اور اس تحریری معاہدہ امن و صلح کے مطابق کسی وقت بھی ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا جائز نہیں ہوتا اسی طرح یہ سماجی میل جول بھی براہ راست ہر مسلمان کے لئے عہد امن کے برابر ہے اس تیسرے اصول کی وضاحت حسب ذیل ہے۔

سماجی معاہدہ امن

ہمارے علمی حلقوں میں سیاسی معاہدوں، صلح حدیبیہ اور صلح مدینہ کا بہت چرچا

ہے لیکن سماجی معاہدہ کا کوئی چرچا نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم اور احادیث رسول میں اس سماجی تعلق کی بڑی اہمیت بیان کی گئی ہے اور قرآن کریم اور احادیث نبوی کی تشریحی کتابیں اس مسئلہ پر وضاحت سے بحث کرتی ہیں۔

اس بحث کا ایک واقعہ یہ ہے کہ حضرت مغیرہ ابن شعبہ نے اپنے قبیلہ کے کچھ لوگوں کو قتل کر کے ان کا مال لوٹ لیا، اس وقت وہ اور ان کا قبیلہ مشرک تھا ان کا مال و اسباب ساتھ لے کر یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور اسلام قبول کر لیا اور وہ لوٹا ہوا مال آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ تمہارا اسلام تو قبول کرتا ہوں مگر یہ مال و اسباب لوٹ کا ہے (مالِ غدر) اسے قبول نہیں کرتا۔

اس واقعہ کی اتنی اہمیت ہے کہ امام بخاری نے اسے مستقل باب (کتاب الشروط) میں نقل کیا ہے اور بخاری کے دونوں بڑے شاہرہین (علامہ عینی اور قسطلانی) نے اس پر بحث کر کے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ غیر مسلموں کا مال و اسباب امن و امان کے حالات میں لوٹ لینا جائز نہیں ہے کیونکہ ایک بستی کے رہنے والے یا ایک ساتھ کام کرنے والے ایک دوسرے سے اپنے آپ کو فطری طور پر مامون اور محفوظ سمجھتے ہیں اور یہ عملی معاہدہ ہے جس میں ہر ایک شہری کی جان اور مال امانت ہے اور امانت میں خیانت کرنا حرام ہے، وہ شہری مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو علامہ قسطلانی کے الفاظ یہ ہیں: فاذا كان الانسان مصاحبههم فقد امن كل واحد منهم صاحبه، فسفك الدماء واخذ المال مع ذلك غدر حرمان الا ان ينذهم اليهم عهدهم على سوار (معارف القرآن ۶ ص ۶۲۳)

یہ مسئلہ (عملی عہد) ہر بستی اور ہر علاقہ کا الگ ہے، ملک کے کسی کونہ میں اگر فساد برپا ہوتا ہے اور اس شہر کے باشندے ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں تو اس فساد سے اس ملک کے تمام رہنے والے فساد کی اور امن شکن قرار نہیں دیئے جاسکتے، اور اگر غیر مسلم آبادی سے کوئی خطرہ محسوس کیا جائے

تو پہلے باہمی بات چیت کی جائے گی اور اطمینان حاصل نہ ہونے کی صورت میں یہ اعلان کیا جائے گا کہ ہم اس سماجی معاہدہ سے دست بردار ہوتے ہیں تاکہ دوسرا فرقہ دھوکے میں نہ رہے۔ یہ مسئلہ بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح دو حکومتوں کے درمیان تحریری معاہدہ میں ہوتا ہے۔

حضرت امیر معاویہؓ نے شام کے کسی علاقہ پر فوجی اقدام کرنا چاہا، لشکر روانہ ہو چکا تھا کہ ایک ضعیف العمر مسلمان چمختے چلائے لشکر کے پیچھے دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ یہ اقدام عہد شکنی ہے جب تک اس علاقہ کے حکمران کو باقاعدہ یہ اطلاع نہ دے دی جائے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان جو معاہدہ امن تھا اسے ہم توڑ رہے ہیں۔ اس وقت تک فوجی اقدام جائز نہیں، امیر معاویہؓ نے لشکر کو واپس بلا لیا، یہ بڑے میاں حصنہ کے ایک صحابی حضرت زید ابن ارقمؓ تھے۔ (اسوہ صحابہ ۲)

حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ غزوہ خندق کے موقع پر ایمان لائے ہیں اس لڑائی میں عرب کے تمام قبائل نے مدینہ منورہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مغیرہ ابن شعبہ نے جن لوگوں کو قتل کیا وہ قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے اور اس قبیلہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ لیکن حضرت مغیرہ نے جس وقت اپنے ہم مذہب (مشرکین) کو قتل کیا اور ان کا مال لوٹا اس وقت وہ اسی قبیلہ اور بستی کے ایک فرد تھے اور آپس میں سماجی اعتماد کے بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔

حضرت مغیرہ نے اس اعتماد کو توڑا اور امانت میں خیانت کی۔ سماجی اعتماد کا مسئلہ پھلی شریعت (توراة) میں بھی موجود ہے اور اسے قرآن کریم نے بھی نقل کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم یہود کا مصری حکمران فرعون سے سخت جھگڑا تھا۔ فرعون یہودیوں پر ظلم کرتا تھا اور ان کے بچوں کو

ہلاک کر ادیا کرتا تھا۔

حضرت موسیٰؑ ایک روز جا رہے تھے کہ راستے میں ایک یہودی اور قبطنی مصری کو آپس میں لڑتے دیکھا، یہودی نے حضرت موسیٰؑ کو مدد کے لئے پکارا آپ نے اس مصری کو سمجھایا مگر اس نے تیزی دکھائی، آپ نے جوش میں آکر اس کے ایک گھونسا مار دیا۔ اتفاق سے وہ مصری ہلاک ہو گیا۔

حضرت موسیٰؑ نے اس فعل پر خدا سے معافی طلب کی استغفار کیا، سوال پیدا ہوا کہ حضرت موسیٰؑ نے اس قوم کے ایک فرد کو ہلاک کیا جس قوم کا حکم ان حضرت موسیٰؑ کی قوم پر ظلم و ستم کر رہا تھا، پھر اس فعل پر شر مند کی کیسی؟ اور استغفار کیسا؟

اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ یہودی پر فرعون بنی ظلم حکومت کا ظلم تھا، مصر کے عام باشندے فرعون کے ظلم میں شریک نہیں تھے، فرعون حکم دیتا تھا، اس کے کارندے ملازم اس پر عمل کرتے تھے، لیکن عام مصری اور یہودی سماجی زندگی میں باہمی میل جول اور بھروسہ کے ساتھ رہتے تھے۔

حضرت موسیٰؑ نے اپنے اس فعل کو شیطانی عمل قرار دیا۔ ہذا من عمل الشیطان (اعانہ ۱۵) کیونکہ یہ حرکت اس سماجی تعلق کے خلاف تھی جو موسیٰؑ کے ساتھیوں اور مصری عوام کے درمیان قائم تھا۔ یعنی سماجی اعتماد کو توڑنا شیطانی عمل ہے۔ اس کو مذہبی جہاد کہنا مذہب کی توہین ہے۔

مشہور منہ و ستانی عالم مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ نے حضرت موسیٰؑ کی شرمندگی، توبہ و استغفار سے استدلال کر کے اس عمل کو عملی عہد کی خلاف ورزی کا واقعہ قرار دیا ہے اور پھر حضرت تھانوی کے خلیفہ ارشد مفتی محمد شفیع صاحبؒ (پاکستان) نے حضرت مغیرہ ابن شعبہ کے واقعہ سے اپنے شیخ کے اجتہادی فیصلہ کی تائید پیش کی ہے (معارف ۶ ص ۲۶۵) یہودیوں کی تاریخ کا ایک واقعہ اور بھی ہے جو ان کی دولت پرستی کے

قابل مذمت ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ جب فرعونؒ کی ظلم سے تنگ آ کر بحکم الہی مصر سے نکلنے لگے اور یہودیوں کو ساتھ لے کر ان کے قدیم وطن ملک شام کی طرف چلے تو یہود نے اپنے پڑوسی مصریوں کو دھوکہ دے کر (خود ساختہ بائبل کے مطابق) ان سے سونے چاندی کے زیورات حاصل کر لئے۔

یہی نہیں بلکہ بائبل یہ بھی کہتی ہے کہ پڑوسیوں کے مال میں یہ خیانت کاری خدا کے حکم سے اور حضرت موسیٰؑ کی اجازت سے کی گئی۔

یہ تحریف بعد کے یہودیوں نے کی اور اپنے رسولوں اور اپنے اجداد کی طرت اتنی بڑی خیانت کاری کو ایک نیکی کے طور پر منسوب کر دیا تاکہ ان کیلئے عزیز یہودی قوموں کے ساتھ دھوکہ دہی اور خیانت کاری کرنے کا جواز پیدا ہو جائے۔

قرآن کریم نے جبل سازی کے اس تصور کی تردید کی اور یہ بتایا کہ جس زلزلہ سے سامری نے بت بنایا تھا وہ یہود کا اپنا تھا، مصریوں سے مستعار لیا ہوا نہیں تھا، کیونکہ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ یہود کو اتنی بڑی خیانت کاری کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔

علماء اسلام نے اس کی وضاحت اس طرح کی کہ یہودی مصر میں عام مصری قوم کے ساتھ سماجی تعلق رکھتے تھے، باہمی تعاون تھا، اعتماد تھا، دشمنی اور مخالفت مصری حکمرانوں سے تھی۔ حضرت موسیٰؑ مصر سے ہجرت کر رہے تھے، کوئی اعلان جنگ نہیں کیا تھا۔ اس لئے دھوکہ دینا اس تعلق و تعاون کی خلاف ورزی کرنا تھا جو جائز نہیں تھا۔

قدیم مفسر تافنی بیضاویؒ نے یہود کو متامن فقہی اصطلاح (یعنی جو مصر میں امن اور سلامتی کے ساتھ قیام کرنے کی سہولت رکھتا ہو، امن کا طلب گار ہو اور وہ امن اسے حاصل ہو۔ یہودی ملک شام (کنعان) سے حضرت یوسف کے

زمانہ میں ترک وطن کر کے مہربانی آئے تھے اور اس وقت کے مصری حکمران نے انہیں مصر میں با عزت قیام کرنے کی اجازت دی تھی اور حضرت یوسف کی رہنمائی میں یہود نے مصر کی ترقی میں بڑا حصہ لیا تھا۔

پھر کئی سو برس کے بعد مصری حکمران فرعون کو بنی اسرائیل کے ساتھ دشمنی ہو گئی، اس دشمنی میں حکمران اور حکومت میں شریک افسران شامل تھے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ اگر اس وقت ساری مصری قوم کو یہود کے خلاف برسرِ جنگ فرض کر لیا جائے، تب بھی کسی دشمن حربی قوم کے مال میں خیانت کرنا کسی متامن کے لئے جائز نہیں تھا۔ (حاشیہ جلالین ۲۶۶)

قاضی صاحب نے مصری عوام کے مال کو مالِ غنیمت قرار دینے کی تردید کی ہے، کیونکہ بعض مسلم علماء نے یہ تاویل اختیار کی تھی، ان حضرات کا ذہن قرآن کریم کے مجمل لفظ (من زمینۃ القوم، طہ ۸۸) سے اس طرف گیا اور وہ بائبل کی تائید میں چلے گئے۔ لیکن عصر حاضر کے علماء تفسیر میں مولانا آزاد اور ان کی پیروی میں مولانا مودودیؒ نے اس تفسیر کی سخت مخالفت کی اور لفظ قوم سے یہودی قوم مراد لی، نہ کہ مصری قوم۔

علماء اسلام کے نزدیک سماجی تعاون و تعلق کی کتنی اہمیت ہے، اس کا اندازہ اس بحث سے لگایا جاسکتا ہے۔

آج یہ ساری تعلیم کتابوں میں محفوظ ہے لیکن مستور (بندر کھی ہوئی) ہے اور جب مسلمان ساری دنیا میں پھیلنے والی قوم تھی اس وقت یہ تعلیم انسانی حقوق کا واضح تصور ساری مخلوق کی جان و مال اور آبرو کو خالق برحق کی امانت سمجھنا، واعظوں کے وعظ کا خطیبوں کے خطبات کا اور صوفیاء کرام کے تزکیہ نفس کا عام موضوع تھی۔

اسی ماحول نے وہ تاجر اور محنت کش تیار کئے جنہوں نے اپنی محنت اور دیانت کے ذریعہ ایک طرف خلق خدا کو نائدہ پہنچایا اور دوسری طرف

اسلام کی صداقت کا نور بھیلایا۔

یہ اپنے اپنے شاندار شہروں سے متبرک عبادت گاہوں سے، عیش و آرام کی زندگی سے نکلتے وقت یہ نہیں سوچتے تھے کہ انہیں ان صنم کدوؤں میں نماز کیلئے مسجدیں بنانے کی اجازت ملے گی یا نہیں، وہ اپنے مذہبی جلوس نکال سکیں گے یا نہیں؟

وہ بغداد، بصرہ، اور دمشق کے راحت کدوؤں سے اس حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے افریقہ کے وحشی علاقوں میں شرق الہند کے جزیروں اور چین جیسے دور دراز ملکوں میں پہنچتے تھے کہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ :

عمر و ابلا دی فعاثل فیما عبادی (حدیث قدسی) اے میرے بندو! میرے شہروں کو آباد کرو تاکہ میکہ بندے ان میں آرام کی زندگی گزاریں۔
اس حکم الہی کی تعمیل عبادت تھی اور خدا کی عبادت کے لئے اس کے رسول محترم نے ساری زمین کو مسجد قرار دے کر مسلمانوں کے لئے آسانی فراہم کر دی تھی۔

شیخ المشائخ کا تجربہ

حضرت سلطان المشائخ خواجہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ہندو قوم میں اسلام کی اشاعت کے بارے میں یہ تجربہ بیان کیا۔ ایک روز شیخ کے ایک نو مسلم مرید کا لڑکا اپنے ہندو بھائی کو ساتھ لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نے اپنے مسلمان مرید سے پوچھا۔ تمہارے اس بھائی کے دل میں اسلام کی طرف رغبت پیدا ہوئی یا نہیں؟ وہ بولا حضرت! میں اپنے اس ہندو بھائی کو اسی غرض سے لایا ہوں کہ یہ آپ کی توجہ سے مسلمان ہو جائے شیخ رحم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا۔

اس قوم پر کسی کے وعظ و نصیحت کا اثر نہیں پڑتا۔ اے اگر کسی

نیک دل مسلمان کی صحبت نصیب ہو جائے گی تو اس کی صحبت سے مسلمان
ہو جائے گا۔ (فوائد ص ۸)

یہ نیچے اور باکر دار مسلمانوں کی صحبت اور ان کا حسن معاملہ اور آپس
میں برادرانہ رہن سہن ہی کا اثر تھا جس نے ہندوستان کے غیر مسلموں کو
اسلام میں داخل کیا۔ (۱۹ مئی ۱۹۴۷ء)



آزاد جمہوری ہندوستان کی



شرعی حیثیت

فقہاء اسلام کی تحقیق کے مطابق

ہندوستان کی شرعی حیثیت کے بارے میں ڈاکٹر عثمانی صاحب کا ایک
طویل تاریخی تبصرہ نظر سے گزرا، جس میں دارالحرب، دارالاسلام اور ہجرت
کے اہم مسائل پر علماء اہل تحقیق کے فیصلے تحریر ہیں لیکن اس مضمون سے یہ
تاثر پیدا ہوتا ہے کہ علماء اسلام ان اہم شرعی مسائل میں مسلمانوں کی قطعی
رہنمائی کرنے سے قاصر رہے اور مسلمانانِ ہند آج تک اسی نامکمل رہنمائی
کی وجہ سے حیران و پریشان نظر آ رہے ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ تبصرہ نگار کی نظر صرف لکھنؤ اندودہ کے علماء حق

ایک محدود درجہ ہی ہے اور انہوں نے دیوبندی مکتب فکر کے علماء و فقہاء کی اجتہادی تحقیقات کا مطالعہ نہیں کیا ہے اور نہ موصوف کی نظر مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کی جماعت جمعیتہ علماء ہند کے فیصلوں پر پڑی ہے۔

ہندوستان کے علماء اسلام کا یہی وہ حلقہ ہے جس نے آزادی کی تحریک میں بھرپور حصہ لینے کے بعد آزاد ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور مسلمانان ہند کو شریعت حقہ کی روشنی میں اپنے ملک کی تعمیری سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ترغیب دی ہے۔

ذیل کا مضمون عثمانی صاحب کے جامع تبصرہ کا تکملہ ہے، عثمانی صاحب اسے اپنے مضمون کے ساتھ شامل فرما کر ممنون فرماتے ہیں۔

عثمانی صاحب نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کی اخلاقی موعظت کے حوالے دئے ہیں۔ موصوف کی ذات آج کے قحط الرجال میں غنیمت و نعمت ہے لیکن جماعت شیخ الہند کے صاحبِ اخلاص اور صاحبِ جرات قائدینِ اسلامی نے تقسیم کی تحریک کے پھیلائے ہوئے زہر کا علاج کرنے کی غرض سے دو ٹوک رہنمائی کی ہے، اور اس پر بگڑے دل بھائیوں کے گالیاں کھائی ہیں اور انہیں دعاؤں کے ساتھ برداشت کیا ہے۔ یہ محترم تائیدین اسلام امتحان کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ورنہ نہ علم کی کمی ہے اور نہ اتقار کی کمی ہے۔

اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نئی نسل کے اندر اسلام اور وطن عزیز کے باہمی تعلق کے بارے میں طرح طرح کے شکوک اور بدگمانیاں جنم لے رہی ہیں بہر حال علماء دیوبند نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے مسلمانوں اور آخری دور کی انگریزی حکومت کے درمیان شرعی تعلق کی نوعیت واضح کی اور شرعی اصولوں کی روشنی میں یہ بتایا کہ مسلمانان ہند اس ملک میں قیدی نہیں ہیں کیونکہ انہیں اسلامی شعائر پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہے۔

اور جان و مال کی حفاظت کے لئے انگریزی حکومت کی طرف مسلمانوں کو رجوع کرنا پڑتا ہے اور انگریزی حکومت اپنے قانون کی پابندی کی خاطر امن دینے کی کوشش کرتی ہے اور یہ صورت حال دونوں طبقوں (حاکم اور رعایا) کے درمیان ایک قسم کے عملی معاہدہ کی ہے۔

یہ خالص اجتہاد تھا جو عالم اسلامی کے مشہور محدث و فقیہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے جمعیتہ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ پشاور ۱۳۲۷ء کے خطبہ صدارت میں پیش کیا۔ اس وقت بڑی بے چیدہ صورت حال تھی۔ ایک طرف انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی جاری تھی اور مسلمان اس تحریک میں براہِ درانِ وطن ہندو سبکدوشیائیوں کے ساتھ شانہ بشانہ شریک تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کو شعائرِ دینی میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی جس کی وجہ سے ہندستان کو دارالحرب کہا جائے اور پھر اس کے تقاضوں پر عمل کرنے کے لئے ہجرت جیسے فعل اختیار کئے جائیں۔ جیسا کہ پہلے کیا گیا۔

اس کا حل حضرت کشمیری کے اس اجتہادِ شرعی میں موجود ہے۔ یہ واضح ہے کہ اسلام نے امن و سلامتی اور بھائی چارے کو بنیادی اصول قرار دے کر اس کے قیام کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ عہد و معاہدہ کا راستہ اختیار کیا ہے اور قیامِ امن و سلام کی غرض سے مسلم حکمرانوں کو تفصیلی شرائط مقرر کرنے کا اختیار دیا ہے اور آج کے جدید جمہوری دور نے معاہدات کی اہمیت اچھی طرح واضح کر دی ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا معاہدہ صلح حدیبیہ کے نام سے کیا ہے اور دوسرا معاہدہ مدینہ کے یہود قبائل سے کیا۔ رسول پاکؐ ان معاہدوں میں قیامِ امن اور تحفظِ انسانیت کی خاطر کہاں تک گئے؟

یہاں تک گئے کہ بعض ظاہری نظر سے دیکھنے والوں کو یہ معاہدے اسلام کی صداقت کے خلاف معلوم ہونے لگے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انہیں مطمئن کرنا پڑا۔

اسلام میں اجتماعی معاہدوں کے علاوہ شخصی عہد کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر کوئی ایک مسلمان کسی دشمن کو اپنی حفاظت میں لینے کا اعلان کرے تو یہ اعلان تمام مسلمانوں پر حجت بن جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام امن و سلامتی کے قیام کے لئے معمولی سے معمولی وسیلہ اور بہانے کو بھی ضائع کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔
 محدث کشمیری کے بعد ہندوستان کے دوسرے امام تفسیر و فقہ اور مجدد طریقت و تصوف مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا اجتہاد ہے۔

مولانا نے قرآن کریم میں بیان شدہ ایک واقعہ حضرت موسیٰ اور مصر کے ایک قبطی کی موت کی توجیہ و تشریح کرتے ہوئے دنیا کے تمام ملکوں میں آباد شدہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان شرعی تعلق کی حیثیت پر روشنی ڈالی۔

دراصل مولانا تھانوی کے سامنے (۱۸۵۳ء) میں دنیا کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات تھے، جن میں مذہبی حکومتوں کا دور ختم ہو رہا تھا اور جمہوری اور قومی حکومتیں قائم ہو رہی تھیں، مذہبی جماعتیں بند یوں کی جگہ سیاسی اتحاد اور قومی محاذ لے رہے تھے۔

ان سیاسی حالات نے دارالحرب اور دارالاسلام اور ہجرت و جہاد کے قدیم تصورات کو ختم کر دیا تھا۔ مولانا تھانوی نے قرآن کریم کے اس واقعہ کو ماخذ قرار دیکر مسلم اور غیر مسلم دونوں طبقوں کے درمیان عملی معاہدہ کی صورت تجویز فرمائی اور جن جن ملکوں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں طبقے سماجی تعلقات میں اعتماد اور باہمی لین دین اور ایک دوسرے کے پڑوس میں بھروسے کے

ساتھ رہنے سہنے کی پُر امن زندگی گزار رہے ہیں انہوں نے اس سماجی تعاون کو عملی معاہدہ کے حکم میں رکھا، اور صاف صاف فرمایا کہ اگر کسی جگہ کوئی غیر مسلم طبقہ مسلمانوں پر زیادتی کرتا ہے تو اس کے انتقام میں دوسری جگہ کے مسلمان اپنے پڑوسی غیر مسلموں کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتے اور ایسا کرنا معاہدہ شکنی اور اعتماد شکنی کی بات ہوگی جو اسلام میں جائز نہیں، البتہ ظلم کا دنا ع اپنے حقیقی بھائی کے مقابلہ میں بھی ضروری ہے۔ دنا ع اور بچاؤ کا معاملہ ایک الگ بات ہے۔

اس شرعی اجتہاد کی تمام بحث حضرت تھانوی کے خلیفہ ارشد مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنے شیخ کے ملفوظات مآثر حکیم الامت مطبوعہ کراچی میں نقل کی ہے۔

آزادی کے بعد یہ بنیادی نکتہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہن میں آیا اور مولانا نے علماء ہند کو اس کی طرف توجہ دلائی۔
(مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت ص ۸۴)

سیرت کے حلقہ کا علو!

۱۵۷ء کے بعد جب ملک میں برطانوی اقتدار قائم ہو گیا تو اس دور کے مصلحین سرسید اور ان کے رفقاء نے ہندوستانی مسلمانوں اور برطانوی حکومت کے درمیان مذہبی اصول کے مطابق تعلق کی نوعیت پر روشنی ڈالی، ڈپٹی نذیر احمد صاحب سرسید کی زبان کہلاتے تھے۔ آپ نے مسلمانوں اور انگریزی حکومت کے درمیان عہد عملی کا تصور پیش کیا، مگر اس میں ڈپٹی صاحب حالات کے دباؤ کے شرعی حد کو پار کر گئے۔ لکھتے ہیں:

عہدِ قولی تو زبانی قول و قرار ہے، عہدِ فعلی یہ ہے کہ زبان سے تو کچھ نہیں کہا، مگر طریقِ عمل سے پایا جاتا ہے کہ فریقین میں ایک طرح کی ذہنی

قرار داد ضرور ہے۔ اسی طرح کا معاہدہ ہم میں اور انگریزوں میں ہے
آگے چل کر لکھتے ہیں:

سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس حالت میں بھی کہاں ہیں
یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ پورے پکے اور شریعت اسلامی کے جو احکام
معطل ہیں خدا نے حکام و قوت کی اطاعت فرض کر کے، ان احکام کو خود ہمارے
حق میں معطل کر دیا ہے۔ اور ہمارے لئے انگریزی قانون ہی اسلامی شریعت
ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو ہندوستان دارالحرب قرار پا کر ہر مسلمان پرتشدد
وطن یعنی ہجرت فرض ہو جائے۔

اور بڑی بات تو یہ ہے کہ رعایا ہونے کی حالت میں قانون انگریزی کی اطاعت
ایک امر اضطراری ہے۔ اور لا یكلف الله نفساً الاّ وسعها الخ کی رو
سے خدا نے ہماری مجبوریوں پر نظر رکھ کر ہمارے حق میں توسیع کر دی ہے
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَىٰ ذَٰلِكَ
(الحقوق والفرائض جلد ۲ ص ۱۳۱)

(۱) قرآنی حکم الوالامر کی اطاعت سے مسلمان حکام کی اطاعت مراد ہے۔
غیر مسلم حکام نہیں ہیں۔

(۲) جابر حکم شریعت کے احکام کو معطل کرتے ہیں تو جبر و اکراہ
کے تحت اس پر صبر کیا جائے گا۔ اور زبان سے اس کے خلاف آواز
اٹھائی جائے گی۔

معاذ اللہ کسی حکومت کا بنایا ہوا قانون شریعت کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔
(۳) کسی ملک سے ہجرت کا حکم اس وقت ہے جب اس دینی شعائر و فرائض پر
یا بندی لگائی جائے۔ برطانوی حکومت نے ایسا نہیں کیا تھا۔

خلافتی دور میں مولانا آزاد نے ہجرت کی تحریک چلائی تھی مگر وہ ناکام ہو گئی
تھی اور جن مسلمانوں نے جوش میں آکر ہجرت کی تھی وہ سخت بربادی سے دوچار

جمعیتہ علماء ہند کا فیصلہ

۴۷ء کے بعد آزاد جمہوری ہندوستان میں علماء حق نے جو فیصلہ کیا وہ شرعی حدود کے اندر رہ کر نہایت اعتدال پسندانہ فیصلہ کیا۔ چنانچہ جمعیتہ علماء ہند کے ناظم مفتی اعظم مولانا محمد میاں صاحب نے ایک فتویٰ جاری کیا اور علماء ہند کے ایک موقر طبقہ کی تائید کے ساتھ اسے شائع کیا گیا کہ ہندوستان کا نمائندہ آئین ایک جمہوری فیصلہ ہے اور یہ ہندو مسلمانوں اور سکھ عیسائیوں کے درمیان امن آزادی اور مساوات کا تحریری معاہدہ قرار پاتا ہے۔

یعنی ہندوستان کی شرعی حیثیت دارالمعاہدہ کی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی نے ہندوستان کو (انگریزی دور میں) اسی مفہوم کے لحاظ سے دارالامن قرار دیا تھا۔

اس فتویٰ کی واضح تائید ہندوستان کے مشہور مفکر ڈاکٹر نجات اللہ صاحب صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس وضاحت کے ساتھ کی کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر بحیثیت ایک داعی حق گروہ کے یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ہندوستانی جمہوریت میں مثبت طور پر حصہ لیں اور اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہوں۔

ایک بیان میں جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا ابواللیث صاحب ندوی نے فرمایا: "ملک کے جمہوری مزاج میں اچھی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور جمہوری مزاج پہلے سے کچھ زیادہ پختہ ہو رہا ہے اور سیکولرازم بھی اپنے اچھے مفہوم میں رفتہ رفتہ اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ (دعوت ۴ دسمبر ۱۹۸۱ء)

دارالاسلام اور دار الحرب کی قدیم اصطلاحوں پر اس جدید دور میں اصرار کرنے والے اہل علم کیسی کیسی پے چیدہ الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پاکستان کے مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب نے اپنی تفسیر (معارف القرآن) میں دارالاسلام کی تعریف قدیم فقہی تعریف سے پنج کرہ کی کہ جس ملک میں مسلم حکومت قائم ہو وہ دارالاسلام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مفتی صاحب کو دنیا میں کوئی ملک ایسا نظر نہیں آیا جس میں قرآن و سنت کی قانونی زماں روائی قائم ہو، اور اس ملک کو مفتی صاحب مثال کے طور پر پیش کر سکیں مفتی صاحب نے قدیم فقہی تعریف کو تو چھوڑ دیا لیکن اس کی جگہ ایک اجتہادی تعریف وضع فرمادی۔ لیکن اس تعریف کی رو سے یہ نتیجہ نکلا جس کی طرف مفتی صاحب کی نظر نہیں گئی کہ مسلم حکومتوں (دارالاسلام) میں سود خوری، شراب نوشی، عورتوں کی عریانی اور حرب عقائد جیسے اکبر الکبائر گناہوں کا عام رواج تسلیم کرنا پڑا۔

اور دار الحرب اور دارالاسلام کے درمیان صرف یہ فرق دامتیاز رہا کہ ایک جگہ غیر مسلم نوکر شاہی کا راج ہے اور ایک جگہ غیر مسلم نوکر شاہی قائم ہے۔ کیا ایسے دارالاسلام مسلمانوں کی شرعی زندگی اور اسلام کے وقار کو کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟

بہر حال ان علماء شریعت کے اجتہادی فیصلوں کے بعد جن ذہنوں میں کبھی کبھی الجھن پیدا ہوتی ہے وہ خدا کی مخلوق میں ہمیشہ رہے ہیں۔

یہ مایوس ذہن طبقہ ہے۔ اس طبقہ کی باتوں کو اہمیت دینا غلط ہے۔ مجھے تو جناب تاباں صاحب کے اس طویل تبصرہ پر تعجب ہوتا ہے جو موصوف نے مسلم پارلیمنٹ کے عنوان پر ایک پمفلٹ دیکھ کر تحریر کیا اور پھر حذیباتی طبقہ کی جھنجھلاہٹ کو اپنے اوپر لے لیا۔

کیا تاباں صاحب کو علم نہیں کہ ملی اجتماعیت کے واقعی اہم تصور کو محض نعروں کے طور پر استعمال کرنے والے علی طور پر یہ بھی نہ کر سکے کہ وہ ایک پلیٹ فارم پر صرف اپنے آپ کو جمع کر لیں۔

پھر عام مسلمانوں پر اس بے جان آواز کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

تو پھر اس قسم کی کاغذی باتوں کا آساخت نوٹس لینا اور وقت ضائع کرنا کیا مناسب ہے؟



حقوق کی جدوجہد

اصول استطاعت کے تحت!

قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں

جو لوگ اسلام کا نام لیتے ہیں، میرا خطاب ان سے ہے، جو لوگ اپنے آپ کو ایک عام دنیا دار قوم سمجھتے ہیں میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔ اسلام میں حقوق کی جدوجہد واجب ہے، مگر اصول استطاعت کے تحت، اس اصول سے آزاد ہو کر نہیں۔ ہندوستان میں مسلم حقوق کی جدوجہد صرف ایک قوم کے تشخص کی حفاظت کا مسئلہ نہیں بلکہ ہندوستان میں جمہوریت کی بقا کا مسئلہ ہے جس سے مسلمانوں کے علاوہ کروڑوں پس کردہ اور مظلوم طبقوں کی عزت و آبرو اور روٹی کپڑا وابستہ ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو حقوق آزادی سے دست بردار ہونے، سپر انداز ہونے اور ایشیا را اختیار کرنے کا مشورہ غیر شرعی ہے۔ البتہ اسلام جیسے باضابطہ اور منظم مذہب نے جو دین فطرت ہے جدوجہد کے لئے استطاعت کا واضح اصول مقرر کیا ہے اس اصول استطاعت اور تکلیف شرعی کی بنیاد پر رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی ہے جو ایک موقع پر کعبۃ اللہ کا طواف کرتے ہوئے آپ کی زبان مبارک پر جاری ہوا، اس کا ترجمہ یہ ہے۔

اے خدا کے گھر! کس قدر پاکیزہ ہے تیری خوشبو، کتنا عظیم ہے تو اور کتنی عظیم ہے تیری حرمت و عزت لیکن قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے ایک مومن کی عزت اور حرمت، اس کی جان کی، اس کے مال کی تیری حرمت و عزت سے خدا کے نزدیک زیادہ ہے اور ضروری ہے کہ مومن کے ساتھ خیر خواہی کا ارادہ کیا جائے۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۲۲: بحوالہ ابن ماجہ شریف)

در اصل یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ اے کعبۃ اللہ! تجھے منہم پرستی سے پاک کرنے کے لئے ہم مسلمان پوری جدوجہد کریں گے۔ لیکن ہم بے استطاعت اور کمزور مسلمانوں کو قریش مکہ کی خونخوار تلواروں کے آگے نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ ان کی جان اور ان کا مال خدا کے نزدیک اس کے گھر (کعبۃ اللہ) سے زیادہ قابل حرمت و عزت ہے۔

چنانچہ رسول پاکؐ نے کعبۃ اللہ کو شرک کی آلودگی سے پاک کرنے کے لئے اس وقت اقدام فرمایا جب کعبۃ اللہ کے اندر اس کے ٹھیکہ داروں نے خانہ جنگی کا ارتکاب کر کے اس کی مقدس سرزمین کو بے قصور (بنی خزاعہ) کے خون سے رنگین کر دیا۔

اس وقت مظلوموں کی فریاد پر ان کی مدد کرنے کی غرض سے رسول پاکؐ اپنے دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے، اور یہ اعلان کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ **الیوم ۴ یوم المرحۃ**۔ آج کا دن رحم و کرم کا دن ہے جنگ و پیکار کا دن نہیں ہے۔

اس طرح دشمنوں کو عفو و کرم کا یقین دلاتے ہوئے کعبۃ اللہ پر امن کا جھنڈا گاڑ دیا گیا، اور ظلم و ستم کے ہیرو رحمت عالم کی محبت و شفقت کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

پھر اس کے بعد اصول استطاعت کی وضاحت مشہور امام فقہ امام ابو حنیفہؒ

نے اس وقت کی جب ان سے عباسی حکمرانوں کی زیادتیوں کے خلاف تلوار اٹھانے کے لئے کہا گیا۔ فرمایا یہ کام (جہاد بالسیف) ایک آدمی کے بنانے سے نہیں بن سکتا۔ حضرات انبیاء کرام بھی اس کی طاقت نہ رکھتے تھے جب تک کہ آسمان سے اس کے لئے مامور نہ کئے گئے یہ فریضہ عام فرائض کی طرح نہیں ہے۔ عام فرائض کو ایک آدمی تنہا بھی ادا کر سکتا ہے۔ مگر یہ ایسا کام ہے کہ اکیلا آدمی اس کے لئے کھڑا ہو جائے تو اپنی جان دے دے گا اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے قتل میں دشمن کو تعاون دینے کا گناہگار ہو گا۔ پھر جب وہ مارا جائے گا تو دوسروں کے حوصلے بھی اس خطرہ کو برداشت کرنے کی ہمت نہ کر سکیں گے۔

(احکام القرآن للبخاری جلد ۲ ص ۳۹)

بابری مسجد کی شہادتِ ملمانوں پر قیامت بن کر ٹوٹی ہے، یہ ظلم و ستم کا عروج ہے، اور ہر کمالِ رازدانی کا قانونِ قدرت برحق ہے۔ لیکن یہ سب خدا کی اپنی مصلحتوں کے تحت رونما ہوتا ہے۔

ہم مسلمان تدبیر کے ساتھ تقدیر پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ تدبیر یہ ہے کہ ہم اجتماعی قوت کا صحیح اندازہ لگا کر جدوجہد میں مشغول ہوں اور پھر جب قضا۔ الہی غالب آجائے تو اسے صبر و رضا کے ساتھ برداشت کریں۔

مولانا مودودی کا آخری پیغام

سب کو معلوم ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی "تحریکِ آزادی کے دور میں اسلامی تحریک کے داعی اور محرک تھے۔ مولانا مرحوم تقسیمِ ہند کے فیصلہ کے بعد جب ہندوستان سے جانے لگے تو انہوں نے مدراس میں جماعت کے اجلاس (مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۴۷ء) میں اپنا آخری خطبہ دیا اور اس میں آزاد ہندوستان میں دینی کام کرنے کے طریقہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

”سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اس قومی کش مکش کا خاتمہ کیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اب تک برپا رہی ہے، میرے نزدیک یہ بات پہلے بھی غلط تھی کہ مسلمان اسلام کے لئے کام کرنے کے بجائے اپنے قومی اغراض اور قومی مطالبوں کے لئے لڑتے رہے۔ مگر اب تو اس لڑائی کو جاری رکھنا محض غلطی نہیں بلکہ مہلک غلطی اور احمقانہ خودکشی ہے۔ نقصان دہ اس لئے کہ ان حقوق کے استقرار کی جتنی کوشش بھی مسلمان کریں گے وہ ہندوؤں کے قومی تعصب کو اور زیادہ مشتعل کرے گی۔

اور اگر وہ اپنی شکایت کو رفع کرانے کے لئے پاکستان کی مدد حاصل کرنا چاہیں گے تو یہ بین الاقوامی پے چیدگی اور کش مکش کا سبب بن جائے گا۔ جس سے ہندو قوم پرستی کو زندگی کی مزید طاقت مل جائے گی۔ (خطبہ مدراس ۱۹۴۲ء)

مرحوم نے اس کے بعد مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان رہنے کی جو نصیحت کی، اس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان اپنے مقصد حیات کے مطابق خیر امت بن کر رہیں اور ہر قدم پر اس کو ملحوظ رکھیں کہ خدا کی عام مخلوق میں اسلام کے بارے میں اچھے خیالات پھیلیں، اسلام کی دنیوی اور اخروی برکتیں فائدے اور کامیابیوں کا یقین دلوں میں قائم ہو۔

اپنے ذاتی اور گروہی مفاد اور سیاسی وقار کے مقابلہ میں اسلام کے وقار اور اسلام کی عزت ان کا مطمح نظر ہے۔ اسی طریقہ کار پر خدا کا یہ وعدہ انہیں پہنچے گا

ہم پر ایمان والوں کی مدد کرنا واجب ہے۔ (روم ۴۷ء)

اے مسلمانو! اگر تم ایمان پر قائم رہے تو سرفرازی تمہارے لئے ہے (آل عمران ۱۳۹ء)

اور مسلمانو! انجام کار کی کامیابی انہی پر ہیزگاروں کے لئے ہے۔ (قصص ۸۳ء)

سلطان المشائخ علیہ الرحمہ کی ہدایات!

خیر امت کو ہندوستان کے موجودہ حالات میں کس طرح رہنا ہے، ہمیں اس کا نہایت واضح لائحہ عمل چشتی مشائخ کے اس داعی کتاب و سنت بزرگ کی تعلیمات میں ملتا ہے جسے سلطان المشائخ حضرت مولانا نظام الدین محبوب الہی علیہ الرحمہ کے نام نامی سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ حقیقت واضح رہے کہ سیاسی اقتدار کسی کا بھی ہو (خلافت راشدہ کے علاوہ) اس نے اسلام کی تعلیم اخوت، محبت اور مساوات کو ہمیشہ خطرہ کی نظر سے دیکھا ہے۔

سلطان جی علیہ الرحمہ بھی سیاسی اقتدار کے نشانہ پر رہے لیکن ان مشائخ نے رحمت عالم علیہ السلام کے پیغام محبت و خدمت کی تبلیغ اور عملی تربیت کے مشن کو اپنے اخلاص، ایثار، عاجزی اور فقر و فاقہ کی بے پناہ قوت سے قائم اور جاری رکھا۔

ان حضرات پر ان کی خانقاہوں میں جارحانہ حملے کئے گئے، حضرت شیخ الاسلام بابا فرید علیہ الرحمہ کو ایک شخص لوہے کی زنجیر سے مارنے آگیا، شیخ مسجد میں تھے۔ اپنی قوت کشف سے اس حملہ آور کے ناپاک ارادہ کو جان کر لوگوں کو آگاہ کیا اور وہ شخص بھاگ گیا۔ شیخ محبوب الہی کی خانقاہ میں ایک شخص چہرے کے ساتھ پکڑا گیا اور وہ ناکام رہ گیا۔ (فوائد ۵۰۵)

حضرت مخدوم چراغ دہلویؒ پر چہرے سے حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا گیا ان بزرگوں نے ان لوگوں کو دیوانہ کہہ کر نظر انداز کیا، ظاہر ہے کہ ان فقراء کے ساتھ زرا زمین اور اقتدار کا کیا جھگڑا ہو سکتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی، کہ یہ حضرات اپنے اخلاق اور روحانی اثر کے سبب جو مقبولیت رکھتے تھے وہ اہل اقتدار کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔

ہر کہ یکشد یکشد!

حضرت محبوب الہیؒ نے اپنے شیخ بابا صاحب کے محل اور صبر پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ شیخؒ نے اسی قوت کے ذریعہ اہل ایذا اور تکلیف دینے والوں پر فتح حاصل کی، پھر ایک نہایت بلیغ فارسی فقرہ ارشاد فرمایا :

ہر کہ بکشد بکشد یعنی جو شخص اپنے نفس و نفسانیت کو مارتا ہے وہ اپنے دشمنوں کو مار ڈالتا ہے۔ نفس کشی سے دشمن کشی ہو جاتی ہے اور ہر کشندہ کشندہ باشد۔

یعنی برداشت کرنے والا ہلاک کرنے والا ہوتا ہے (فوائد الفوائد ۲۱۶)

ایک مجلس میں جفاکاری کو برداشت کرنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ایک نہایت جذباتی شعر پڑھا۔

ہر کہ او خارے ہند در راہ ما از دشمنی
ہر گل کمز باغِ عمرش بشکفد بے خار باد

یعنی جو شخص بھی دشمنی میں ہمارے راستے میں کانٹے بچھائے، اے خدا! اس کی زندگی کے چمن کا ہر پھول بے کانٹے کھلا ہے۔ اس شعر کو بار بار پڑھو، اس شعر میں الہامی نور جھلک رہا ہے،

پھر فرمایا، اگر کوئی شخص تمہارے لئے کانٹے بچھائے اور تم بھی ان کے راستے میں کانٹے بچھاؤ تو کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔ (فوائد ۴۸۰)

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک گجراتی بزرگ کے حوالے سے خدمت خلق کی اہمیت بیان فرماتے ہوئے کہا: ایک بزرگ تالاب پر وضو کرنے گئے۔ اس وقت کچھ عورتیں اپنے پانی کے گھڑے لے کر آگئیں اور ان سے کہا کہ ہمارے گھڑے بھر دو، انہوں نے بھر دیئے۔ یہ وضو کر کے گھر آئے، ان کے ایک ساتھی جو صاحبِ دل تھے وہ سو رہے تھے، انہوں نے اپنے اس ساتھی کو بیدار کرنے کے لئے ادنیٰ آواز میں نماز کی تکبیر کہی۔ وہ ساتھی جاگے اور بولے :

یہ کیا شور مچا رہا ہے، ارے! اصل نیکی تو وہ تھی جو تو نے ان عورتوں کے

پانی کے گھڑے بھر کر دیئے۔ (۷۷۶)

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک موقع پر ہندوؤں میں اسلام کی اشاعت کے سبب پر روشنی ڈالی، واقع یہ ہوا کہ شیخ کا ایک مرید اپنے ہندو بھائی کو ساتھ لایا اور گزارش کی کہ میں اسے آپ کی نظر کرم کے لئے لایا ہوں کہ اس میں اسلام کی محبت پیدا ہو جائے۔

شیخ نے فرمایا: ایں قوم را چنداں بگفتہ کے دل نہ گردد۔ اس قوم کا دل کسی کے کہنے سننے سے نہیں بدلتا، ہاں، اسے اگر کسی نیک آدمی کی صحبت مل جائے تو امید ہے کہ اس کی برکت سے یہ اسلام سے محبت کرنے لگے۔

پھر شیخ علیہ الرحمہ نے حضرت بایزید بسطامی کے حوالہ سے مسلمانوں کے بگڑے ہوئے معاشرہ پر روشنی ڈالی اور فرمایا:

حضرت بایزید کے پڑوس میں ایک یہودی آباد تھا، حضرت کے وصال کے بعد کسی نے اس سے پوچھا کہ تو ایسے بااثر بزرگ کے پڑوس میں رہتے ہوئے مسلمان نہ ہوا؟

اس نے جواب دیا کہ۔ کون بیا اسلام قبول کروں، اگر بایزید والا اسلام تو وہ میرے بس کا روگ نہیں اور اگر تم لوگوں کا اسلام، تو ایسے اسلام سے مجھے شرم آتی ہے۔ (ص ۸۰۰)

یہ بات آج سے تقریباً ہزار سال پہلے کی ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے اپنے دور (آج سے سات سو برس پہلے مسلم حکومت میں ہندو مسلم تعلقات کی نوعیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

بدایوں میں ایک قاری شادی نام کے قاری تھے، اُن کی کرامت کا یہ حال تھا کہ یہ جس شخص کو ایک پارہ قرآن کریم کا پڑھا دیا کرتے تھے اسے پورا قرآن یاد ہو جاتا تھا۔ میں نے (سلطان جی نے) بھی ان سے ایک پارہ پڑھا اور مجھے اس کی برکت سے پورا قرآن یاد ہو گیا۔ یہ قاری شادی

ایک ہندو کے غلام تھے (غلام ہندو بود) (ص ۷۰۹)

جو لوگ مسلم دور حکومت کو ایک بدترین ظلم و ستم کا دور کہتے ہیں وہ غور کریں کہ اس دور میں ایک ہندو۔ ہندو رہتے ہوئے اپنے ایک صاحب کرامت غلام کو قرآن کریم کی تعلیم میں مشغول رہنے کا موقع دیتا ہے۔ اس کی نظر میں یہ بات نہیں کٹکی کہ اس کی غلامی میں رہنے والا قرآن کریم کی اشاعت کر رہا ہے اگر مسلم بادشاہوں کا دور ہندوؤں کے حق میں ظلم و ستم کا دور تھا تو آخر اس ہندو کے دل میں اسلام اور قرآن کی یہ محبت کیسے قائم ہوئی تھی۔؟ اور اسی کے ساتھ مسلمان غور کریں کہ ہمیں اپنے وطن عزیز ہندوستان کی سرزمین سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

اپنے مسائل کی جدوجہد کے ساتھ وطن عزیز کی خیر خواہی ہمارا دینی فریضہ ہے اگر ہم سے اس میں کوتاہی ہوئی تو ہم فرقہ پرستی سے شکست کھا جائیں گے۔ ورنہ سیاسی اقتدار کا جنون ہمیشہ قائم نہیں رہتا۔ قانون قدرت یہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کا ایک نہایت حسین ادبی استعارہ ہے جس میں اس کلام ربانی نے مسلمانوں کو کھایا

الزَّوْرَانَا أَرْسَلْنَا الشَّيْطَانِ عَلَى الْكُفْرَيْنِ تَوَهُّوْهُمُ آذَانًا ۝ فَلَا تَجْعَلْ عَلَيْهِمْ إِثْمًا لَّعَذَابُهُمْ عَذَابًا ۝ (مؤکم)

اے مخاطب! تو نے غور نہیں کیا کہ ہم نے ان مفسدین پر شیطان چھوڑ رکھے ہیں جو ان میں چو لھے پر رکھی ہوئی ہنڈیا کی طرح ابال پیدا کرتے رہتے ہیں تو تم جلد بازی نہ کرو، ہم ان کی زیادتیوں کو شمار کرتے رہتے ہیں (سورہ مريم ۸۴) یعنی جس طرح اردو محاورے کے مطابق باسی کڑی میں ابال آتا رہے گا۔ اسی طرح ان مفسدین کی شرارتوں میں ابال آتا رہے گا اور قدرت کا قانون جب دیکھے گا کہ پیمانہ ظلم لبریز ہو گیا تو پھر وہ حرکت میں آجائے گا۔ خدا کی ساری مخلوق اس کا کنبہ ہے۔ اس کے سب سگے ہیں کوئی سوتیلا نہیں۔

احمد

اقلیت کا

سرمایہ حیات

ہمارے بعض فرقہ پرست دوست ہندوستان میں آنے والے اکابر صوفیاء کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ حضرات مسلم حملہ آوروں (غزنوی اور غوری) کے ایجنٹ تھے انہوں نے مذہب و روحانیت کے پردہ میں ان بادشاہوں کے لئے زمین ہموار کی۔ تاریخی اعتبار سے تو اس کی تردید پروفیسر ارنلڈ نے پریچنگ آف اسلام میں کی ہے۔ یہ مورخ ایک غیر جانبدار مورخ ہے کیونکہ اس نے مسلم عہد کے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ تشدد کے پہلو پر بھی اور پرامن دعوت کے پہلو پر بھی۔ یہ لکھتا ہے۔

۱۱ اٹھارہویں صدی عیسوی تک شمال مغرب نے ہندوستان پر مسلم حملہ آوروں کا تانتا بندھا رہا۔ لیکن یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ ان حملہ آوروں میں سے کسی کے ساتھ بھی مسلمان مبلغ اور صوفی آتے ہوں۔ (پریچنگ ص ۲۰۵)

ہو سکتا ہے کہ ان دوستوں کو ان بعض افراد کی زندگی سے غلط فہمی ہوئی ہو

جو مسلمان فوجوں کے ساتھ جنگ میں شرکت کرتے ہوئے آئے اور ان کے مرنے کے بعد لوگوں نے انہیں ایک ولی کے طور پر احترام دینا شروع کر دیا، یقیناً ہندوستان میں ایسے مزارات بھی ہیں۔ لیکن یہ بات ان صوفیاء کرام کے بارے میں بالکل بے بنیاد ہے تاریخی اعتبار سے بھی اور عقلی اعتبار سے بھی جن کا مشن و مقصد توحید و نبوت کی روشنی پھیلانا تھا۔

ان چشتی، سہروردی اور قادری بزرگوں کی آرام گاہیں کشمیر سے لے کر مدراس تک پھیلی ہوئی ہیں اور ہندو مسلمان اور سکھ بھائی ان کی روحانی اور اخلاقی برکتوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

عقلی اعتبار سے یہ بات اس لئے بے بنیاد ہے کہ تبلیغ و دعوت ایک ایسی اہم دینی ذمہ داری ہے جس کے تقاضے بالکل الگ ہیں، قرآن کریم نے اس امت کا مقصد حیات ہی قرار دیا ہے کہ وہ ہر جہت سے اپنے آپ کو خلقِ خدا کے سامنے اسلام کی سچائی کا نمونہ بنا کر پیش کریں اور ساتھ ہی قرآن کریم نے دعوتِ حق کے آداب، شرائط و رتباخ کے سلسلہ میں مسلمانوں کو واضح ہدایات دی ہیں۔

تبلیغ کے بنیادی اصولوں میں ایک اہم اصول تعاون ہے۔ یعنی خدا کی مخلوق کے ساتھ دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ حیوانات اور نباتات کے ساتھ مدد کرنے اور خدمت کرتے کارویا اختیار کیا جائے۔ خدا کی مخلوق کو اپنا رقیب اور دشمن فرض نہ کیا جائے، بلکہ خلقِ خدا کو خدا کا کنبہ (عیال اللہ) تصور کر کے ان کے ساتھ داعی اور مدعو، طبیب اور علیل اور معلم اور متعلم کا رشتہ سمجھا جائے۔

قرآن کریم مسلمانوں کو خیر امت (اچھی امت) کا لقب دے کر خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی اور ہدایت پہنچانے کا کام کو ان کا فرض قرار دیا، سب کو حق و ذلیل سمجھ کر انہیں اپنی رعایا اور غلام بنانے کا کام سپرد نہیں کیا۔

اسلام نے اپنے اس بنیادی اصول (خلق خدا کے ساتھ تعاون) کا ایک نہایت اہم موقع پراعلان کیا۔

موقع یہ پیش آیا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقوں کے ساتھ کعبۃ اللہ کا عمرہ ادا کرنے تشریف لے گئے۔ لیکن آپ کے مخالفین اہل مکہ نے آپ کو عمرہ ادا کرنے سے روک دیا آپ خدا کی ہدایت کے مطابق معاہدہ صلح کر کے واپس آ گئے، لیکن آپ کے بعض ساتھیوں نے یہ ارادہ کیا کہ مدینہ کے اطراف سے عمرہ کی عبادت کے لئے مکہ جانے والوں کا راستہ روک کر ان کے ظلم کا بدلہ لیا جائے، ان کا یہ ارادہ خدا نے علیم و خبیر کے علم میں آیا۔ اور خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو دشمنوں کے ساتھ انتقامی کارروائی کرنے سے روکا اور یہ حکم نازل ہوا۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا
وَتَعَاوَنُوْا عَلٰى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى سُوْلًا تَعَاوَنُوْا عَلٰى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۱)

”اے مسلمانو! ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کرے کہ تم بھی ان کے ساتھ زیادتی کرنے لگو دیکھو! جو کام بھلائی اور نیکی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کیا کرو اور جو کام گناہ اور زیادتی کے ہیں ان میں تعاون نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اس کی سزا بہت سخت ہے۔ (المائدہ ۲۵)

اس اہم آیت کی تفسیر میں برصغیر کے مشہور عالم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے یہ نوٹ تحریر کیا ہے: ”ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ ایسے معاند دشمنوں کے حق میں اس قدر رواداری کی تعلیم کہیں موجودہ اصول سیاست کے خلاف تو نہ ہوگی کیونکہ ایسا نرم برتاؤ دیکھ کر مسلمانوں کے خلاف شریروں اور بدبخلوں کی جرات بڑھ جانے کا قوی احتمال ہے۔ اس کا ازالہ بالقوال اللہ و علی اللہ ملیتو کل المؤمنون کے فقرہ سے فرما دیا۔ یعنی مومن کی سب سے بڑی سیاست تقویٰ اور

نوکلی ہے، خدا سے ڈرنا اور اسی پر بھروسہ کرنا، خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ
ظاہر و باطن میں اس سے اپنا معاملہ صاف رکھو اور جو عہد و اقرار کئے ہیں ان میں
پوری وفاداری دکھلاتے رہو، پھر بحمد اللہ کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ (جمائل ۱۴۰)
آیت مذکورہ میں برائیوں سے عدم تعاون کو تعاون سے مؤخر کر کے بیان کیا ہے
کیونکہ نہی عن المنکر بہت نازک بات ہے اور اس کے لئے ہادی اسلام نے کئی
شرطیں مقرر کی ہیں۔

عمرہ میں بت پرستی

مشرکین عرب کا عمرہ بت پرستی میں آلودہ تھا، کعبۃ اللہ اس وقت تک
ایک صنم کدہ تھا، اس لحاظ سے مشرکین عرب کے عمرہ کو روکنا بت پرستی کے فعل کو
روکنا تھا۔ مگر قرآن کریم نے اسے برداشت نہیں کیا کیونکہ مداخلت کا یہ فعل
مذہبی آزادی کے اصول کے خلاف تھا۔

تعاون سے اعتماد

فطری بات ہے کہ باہمی تعاون سے اعتماد پیدا ہوتا ہے اور اعتماد اور بھروسہ
کے بغیر معاشرہ میں امن اور ترقی کے حالات پیدا نہیں ہوتے۔
ہندستان کی بات چھوڑے، یہاں تو ان صوفیائے کرام کے آگے پیچھے
مسلمان حکمران آتے رہے جس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن ان ملکوں
میں آنے والے مبلغ اور واعظوں کے لئے کیا کہا جاتے گا جن ملکوں میں مسلم
حکمرانوں کے قدم نہیں پہنچے اور کوئی فوج کشی نہیں ہوئی اور آج وہ ملک عظیم
مسلم ملک ہیں۔

چین، شرق الہند کا علاقہ، افغانستان اور افریقہ کے بڑے حصے میں

اور جنوبی ہند اور کشمیر میں اسلام پھیلا، اور وہاں مسلمان تاجروں، قادی
اور چشتی صوفیوں اور محنت کش مزدوروں کی آمد و رفت کے سوا کوئی فوجی کشمکش
نہیں ہوئی۔ اور تاریخ کی ورق گردانی کے باوجود ہمیں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا
جس میں ان تاجروں اور صوفیوں کے مسلم حکمرانوں کے ایجنٹ ہونے یا اہل
سیاست کے آلہ کار ہونے کا معمولی ثبوت بھی موجود ہو۔

یقیناً یہ ایجنٹ تھے لیکن آسمانی صداقت کے ایجنٹ تھے کسی اپنے یا
پرائے کی سیاست آلہ کار نہیں ایجنٹ کہنا اپنی عقل کو اندھا بنانے کی کوشش
کرنا ہے۔ جس مقصد کے لئے نکلے تھے اس کے پیش نظر ان کے نزدیک یہ بات
گناہ کی تھی کہ جن غیر مسلموں کے ساتھ ان کے تجارتی اور سماجی تعلقات قائم ہوئے تھے۔
انہیں کمزور کریں اور غیر مسلموں کے اعتماد کو نقصان پہنچائیں۔ اور تاریخ میں اس قسم کا
بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ اس وقت کے مسلم حکمرانوں نے ان اہل دعوت کو اپنے
سیاسی اغراض کے لئے استعمال کیا ہو، کیونکہ یہ طبقہ مسلم حکمرانوں کی مالی
امداد سے اور سیاسی سرپرستی سے بالکل آزاد رہا اور ان کی سرگرمیاں
انفرادی رہیں ان حکومتوں نے اسلام پھیلانے کی غرض سے کئی شرعی منہویہ
اور نظام دعوت کے قیام سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔

انہیں اپنے اندرونی جھگڑوں سے فرصت ملتی تو اس طرف توجہ دیتے۔
البتہ خالق ہوں کے نام سے کچھ آزاد تربیتی ادارے قائم تھے جہاں توحید و
نبوت کے شیدائی تیار ہوتے تھے اور ہر طرف پھیل جاتے تھے۔

قوم اور وطن کے الفاظ سے جن لوگوں کو وحشت ہوئی ہے وہ قرآن کریم
اور احادیث نبوی کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کریں۔ تقسیم ہند کی زہریلی
کتابوں کا ان کے دماغوں پر جو اثر ہے اسے دور کریں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے رفقاء
نے قدم قدم پر اور وطن کے ساتھ اتفاق و تعاون کا جو پیغام دیا وہ اسلام کی

اسی بنیادی تعلیم پر قائم ہے۔

آج بھی ہندوستان میں اگر ہم دین کی سر بلندی اور دین کا احیاء چاہتے ہیں تو تعاون کے راستے سے اعتماد حاصل کرنا ہوگا، اہل سیاست اپنے ہوں یا غیر، ان کی خود غرضانہ چالوں سے اپنا دامن بچانا ہوگا۔

دین کے ہتھیاروں سے دنیا کی جنگ کا زہرا بھی تک پھیلا ہوا ہے، یہ طریقہ کار ہمیں مزید تباہی کی طرف لے جائے گا، بلکہ اس سیاسی کھیل سے دین کی بدنامی کا عتاب نازل ہوگا۔ دین سر بلند ہوگا، اپنی قوت سے اپنے ہادی برحق کی سنت پر چل کر۔

ان اہل سیاست کے بھڑے میں آکر جو نوجوان اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں کاش! وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں اور ہندوستان میں دین توحید و مساوات کے لئے جو موقع پیدا ہوا ہے اپنی تعمیری جدوجہد کے ذریعہ اس سے کام لیں، ورنہ تاریخ ان سے سخت جواب طلب کرے گی۔



مہنہیں اے ہم نفس بے وجہ میری گریہ سامانی
نظر اب واقفِ رازِ تبسم ہوتی جاتی ہے

یہ قتل کے فتوے؟

بنگلہ دیش کی خاتون سلیمہ نے قرآن کریم کے بارے میں کچھ نازیبا کلمات کہہ دیئے، جن کلمات سے اس مسلم خاتون کے ایمان کی نفی ہوتی ہے، چنانچہ اس پر ارتداد (مذہب سے پھر جانے) کا فتویٰ لگا دیا گیا اور اسے قتل کرنے کا مذہبی فتویٰ بنگلہ دیش کے مفتی صاحب نے جاری کر دیا شیطانی آیات کے گستاخ مصنف کا معاملہ چل ہی رہا تھا کہ ایک اور معاملہ کھڑا ہو گیا، معلوم ہوا ہے کہ کسی یورپین سفارت خانے کی اسے پناہ حاصل ہو گئی ہے۔ اس قسم کے واقعات بظاہر انفرادی ہیں لیکن دراصل یہ ایک تحریک ہے اور اس تحریک کی ابتداء رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہو گئی تھی۔ مدینہ منورہ کے یہودیوں نے یہ اسکیم بنائی کہ کچھ یہودی حضوٰر کے پاس صبح کو جا کر مسلمان ہو جائیں اور شام کو اسلام سے بنزاری کا اعلان کر دیں تاکہ ان کے اس فعل سے دوسرے مسلمان اسلام کی طرف بد دل ہو جائیں۔

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَيَّ الَّذِينَ آمَنُوا
وَجَاءَ النَّهَارُ وَكَفَرُوا وَآخَرُهُ لَعَلَّكُمْ يَرْجِعُونَ۔ (آل عمران ۷۲)

قرآن کریم نازل ہو رہا تھا، اس نے یہودی سازش کا انکشاف کر دیا اور حضوٰرا در آپ کے ساتھ ہی ہوا ہو گئے، رسول پاکؐ نے یہودیوں

کی اس مکروہ سازش پر کوئی ایکشن نہیں لیا حالانکہ اس قسم کی سازش اور مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے کی یہ کوشش اس معاہدے کے خلاف تھی جو آپ نے یہود سے کیا تھا اور انہیں باوجود ایک اقلیت ہونے کے مدینہ کی مسلم ریاست میں مکمل آزادی عطا کی تھی، اس کے بعد اس قسم کی ایک تحریک عیسائیوں نے شروع کی اور یہ واقعہ اسپین کی مسلم حکومت میں پیش آیا۔

تھامس ارنلڈ نے لکھا ہے کہ کچھ عیسائی پیادریوں نے مسلمانوں کی فراخ دلی اور رواداری کو دیکھ کر شہادت کی تحریک شروع کی یہ لوگ بازاروں میں نکلتے اور رسول پاک کی شان میں گستاخیاں کرتے تاکہ مسلمان عوام متعل ہو کر ان پر ہاتھ چھوڑ دیں اور ان کے خلاف عیسائی عوام میں ظلم و تشدد کا پروپیگنڈہ کیا جائے، چنانچہ ایک مقام کے عیسائیوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔

سلطان محمد اول نے ان کے خلاف فوجی اقدام کیا، مگر جب اسے معلوم ہوا کہ عیسائی، اور عیسائی پبلک اس تحریک کے خلاف ہیں تو اس نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا، البتہ اس نے توہین رسالت کو روکنے کے لئے سخت تعزیری قوانین نافذ کر دیئے۔ اور حکومت کو فساد انگیزیوں سے بچانے کے لئے اس کا یہ قدم ضروری تھا یہ نویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے، اس کے بعد ہسپانیہ کی عیسائی مجلس علمائے اس تحریک کے خلاف فیصلہ کر کے اسے بند کرایا۔ (پریچنگ آف اسلام ص ۱۲۶)

ارتداد بغاوت ہے

اسلام میں ارتداد کی سزا واقعی قتل ہے لیکن اس لئے نہیں کہ مرتد مذہب چھوڑ دیتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ حکومت میں ابتری پیدا کرنے کو

باغیانہ کوشش کرتا ہے۔ ایک شخص پانچ منٹ پہلے جس مذہب پر ایمان لایا تھا اسی مذہب کو پانچ منٹ بعد برا بھلا کہنے لگے تو کیا اس کا یہ فعل سنجیدگی پر مشتمل ہوگا۔ یا اسے ایک سازش کہا جائے گا؟ جو مذہب عقیدہ کے معاملہ میں مکمل آزادی کا علم بردار ہے، اسلام صرف بھلے اور برے انجام سے آگاہ کرتا ہے اس مذہب کے ساتھ اس قسم کی نا انصافی اور سازشی حرکت کیا کوئی معقول بات ہے؟ پھر اگر وہ مذہب اپنے معاشرہ کی حفاظت کے لئے کوئی سخت قدم اٹھاتا ہے تو اس پر اعتراض کی کیا گنجائش ہے؟

ارتداد کی سزا

ارتداد یعنی بغاوت کی سزائیں اختلاف ہے، یہ مسئلہ منصوص نہیں ہے بلکہ اجتہادی ہے، بخاری شریف کی حدیث ضروریہ ہے۔

مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاَقْتُلُوْهُ

ترجمہ: جو شخص اپنا مذہب تبدیل کر دے اسے قتل کر دیا جائے، لیکن اس حدیث کے مفہوم اور اس کی تشریح میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پہلا اختلاف یہ ہے کہ اس سزائیں عورت داخل نہیں ہے، امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ جس عورت کو میدان جنگ میں فساد یوں کے ساتھ ہونے کے باوجود قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ عورت فطری طور پر جنگجو نہیں ہے تو پھر اسے ارتداد کی سزا میں کیوں قتل کیا جائے؟ امام ابو حنیفہؒ سیاسی مسائل میں اسلام کے عام بے لاگ انصاف کو پیش نظر رکھ کر احادیث نبوی کی تشریح کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ امام صاحب حضرت ابن عباسؓ صحابی کے قول سے دلیل دیتے ہیں۔

اِذَا رَتَدَ نِسْبَتُهَا لَا يَمْلِكُ

عورتیں جب ارتداد اختیار کریں تو انہیں قید کی سزا دی جائے، ہلاک

کرنے کی سزا نہ دی جائے۔ (حوالہ مبسوط جلد ۱ ص ۱۱۱)

مرد اگر فعل ارتداد اختیار کرے تو اس پر فوری طور پر سزا کا اجرا نہیں ہوگا بلکہ تین دن تک اسے قید میں رکھا جائے گا اور روزانہ اس سے بات چیت کر کے اس کے شبہات دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

یہ تین دن کی مدت امام شافعیؒ کے نزدیک واجب ہے، اس سے پہلے اس پر سزا جاری کرنا ناجائز ہوگا اور اگر کوئی مسلمان جوش میں آکر اسے ہلاک کر دے گا تو اس کا یہ فعل قابل تعزیر و تادیب ہوگا اسے دینی جذبہ قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ (کنز ص ۲۱۳)

سابق ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مولانا محمد تقی صاحب امینی علیہ الرحمہ نے ارتداد کی سزا کے بارے میں فقہاء کا اختلاف تفصیل سے نقل کیا ہے، جس میں امام ابو بوسفہؒ کا قول یہ ہے کہ امیر المسلمین ارتداد اختیار کرنے والوں پر غلبہ حاصل کر کے اگر انہیں معاف کر دے گا تو یہ خست اور گنجائش جائز ہوگی۔ امام سفیان ثوری (وفات ۱۶۱ھ) قید میں ڈالنے کے قابل ہیں اور اس دوران میں اس کے شبہات دور کر کے اسے توبہ پر تیار کرنے کی تجویز رکھتے ہیں۔ امام حسن بصریؒ بھی قتل کرنے سے اتفاق نہیں رکھتے۔

قال الحسن البصري ان المروق قد بين لا يشتاب فلا يجب قتله في الحال

(ميزان للشعراني باب المروء ۱۵۶)

امام عبد الوہاب شعرانیؒ اس اختلاف کو امت کے حق میں رحمت سے تعبیر کیا ہے کیونکہ امت کے حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہ سکتے، تدریجی قیادت امت کے حالات (کبھی اقتدار اور کبھی زوال) کو سامنے رکھ کر اس فعل مجرمانہ کی روک تھام کرے گی۔

(حالات کی رعایت ص ۱۷۸)

توسعة عليهم وعلى اتباعهم في وقائع الاحوال المتعلقة بفروع الشريعة

(میزان اول)

اس حدیث کی تشریح میں پہلا عملی اختلاف خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوا اور آپ نے ایک با اختیار امیر کی حیثیت سے ارتداد اختیار کرنے والوں کے ساتھ مختلف طرز عمل اختیار کئے، جس میں ایک عمل معاف کر دینے کا بھی تھا اور بعض واقعات میں سخت ترین سزائیں دینے کا عمل بھی شامل تھا۔ (رعایت زمانہ ۱۷۷)

ان ابا بکرؓ سبھی النساء والذرائع من بنی حنیفہ (مبسوط ۱۱۸) معلوم ہوا کہ ارتداد کی سزا بھی جزیہ کی طرح امیر اسلام کی صوابدید پر چھوڑی گئی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فقہاء کے اندر اختلاف کا سبب حضرت ابو بکر کے طرز عمل کا اختلاف ہے۔

سزا کہاں جاری ہوگی

یہ سزا قاضی شرع (عدالت) کے فیصلہ کے بعد مسلم حکومت جاری کرے گی اور اس سزا کا دائرہ اس حکومت کے حدود میں ہوگا۔ کسی دوسرے ملک میں داخل ہونے والا اس ملک کے قانون کی پابندی عہد (ویزا) کا شرعاً ذمہ دار ہے۔ اور جس غیر مسلم ملک کا قانون مذہب بدلنے کو کوئی جرم قرار نہیں دیتا۔ اس ملک میں نقص امن کے قانون کے تحت یہ معاملہ اٹھایا جائے گا اور کسی بھی جرم کی سزا دینا عوام کی نہ ذمہ داری ہے اور نہ ملک کے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر تمام مسلمانوں کے لئے بے وجہ خطرات پیدا کرنے کی اجازت مذہب دے سکتا ہے۔ یہ جرم مسلمانوں کے حق میں ارتداد کے جرم سے ہلکا نہیں ہے۔

مذہب کا احترام

رسول پاکؐ کی ایک گراں قدر ہدایت یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اس کے روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ کا ثواب اسی قدر ملے گا جس قدر اس نے عقل مندی کے ساتھ موقع و محل اور حالات اور ماحول کی رعایت کر کے وہ عبادت ادا کی۔

مَا يَجْزِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْإِنْقَادَ (عقلہ) (مشکوٰۃ شریف)

ترجمہ: قیامت کے روز ہر شخص کو اس کی عقل کے بقدر جزا دی جائے گی۔

کل سپانیہ میں ایسے معقول عیسائی موجود تھے جنہوں نے اپنی قوم کی جذباتی تحریک شہادت کی مخالفت کر کے اسے ختم کرایا۔ لیکن آج کی مسیحی دنیا جمہوری آزادی کے نام پر خود اپنے رسول حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کفریہ تصورات پر کوئی ایکشن نہیں لیتی اور جس فرقہ (یہودی) نے ہمیشہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ایک غیر پسندیدہ ماں (مریم) کا بیٹا قرار دیا اور ایک مقدس رسول کی سخت توہین کرتے رہے انہیں عیسائی دنیا اپنا یا ر غار بنائے بیٹھی ہے پھر یہی وہ دنیا ہے مغرب ہے جو ہر مسلم ملک کے اندر (سفارت خانوں کی صورت میں) اپنی اپنی آزاد کالونیاں قائم کئے بیٹھی ہے اور مسلمان اپنے اسے کرم فرماؤں سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے۔

یہ مذہبی مجرموں کی پناہ گاہیں ہیں اور دوسری طرف مذہبی دیوانوں کی پشت پناہی کر کے ان کے ذریعہ کمزور ملکوں میں افراط فزی پھیلانے والے سازشی مرکز ہیں۔

ہمارے سادہ لوح مذہبی دیوانے ان مغربی طاغوتوں کی دوسری چال کو نہیں سمجھتے اور ان کے فریب لالچ اور طمع میں آکر مذہب اسلام کے تقدس کو بدنام کرنے کی روسیاہی حاصل کرتے ہیں۔

عزیمت اور رخصت دونوں شریعت کا حصہ ہیں

اصل حکمت ہے، حکمت کے مطابق عمل کا درجہ متعین ہونا ہے

موجودہ دور روحانیت پر مادی غلبہ کا ہے، غلبہ باطل زندگی کے ہر شعبہ پر طاری ہے۔ طرح طرح کی رکاوٹوں نے مسلمانوں کو گھیر رکھا ہے۔ عبادت میں ظاہری رکاوٹیں نہ سہی لیکن خود مسلمانوں کا خوشحال زندگی گزارنے کا جذبہ (جو عام دنیوی زندگی کی ترقی کا اثر ہے) انہیں دنیا کے حاصل کرنے پر متوجہ کر رہا ہے۔ یہ اندرونی رکاوٹ ہے، معیشت مکمل طور پر کسبِ حرام میں جکڑی ہوئی ہے۔

ایسے ہی حالات تھے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی ہے،
 اَنْتُمْ فِي زَمَانٍ مِّنْ تَمَدُّ لَيْسَ مِنْكُمْ عَشْرٌ مَّا امْرِيْهِ هَلَكَتْ نَفْسٌ يَّاتِي زَمَانٌ مِّنْ عَمَلِنَا
 بعش ما امر به نجا — (مشکوٰۃ ۳۱ بحوالہ ترمذی)

تم لوگ اس وقت روحانی غلبہ کے دور میں ہو اس وقت جو شخص احکاماتِ الہی کے دسویں حصہ کو بھی چھوڑے گا تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔ پھر اس کے بعد ایک زمانہ باطل کے غلبہ کا آئے گا، اس زمانہ میں اگر کوئی دسویں حصہ پر عمل کرے گا تو وہ مجبور شمار ہو گا اور اسے نجات مل جائے گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان بہانہ بنا کر شریعت پر عمل کرنے میں سستی اختیار کرنے لگیں بلکہ واقعی مجبوری کے وقت مسلمان کی بے عملی کو تعالیٰ رخصت کے درجہ میں رکھ کر اسے نجات دیدے گا۔

خدا تعالیٰ غیب و شہادت کا جاننے والا ہے، باطل کے غلبہ سے نکلنے کی کوششِ حربِ مقدور مسلمانوں پر فرض ہے اور نبی عن المنکر دین کے اہم ترین احکام میں داخل ہے لیکن اس کے عین درجہ میں جو مشہور حدیث میں بیان کے گئے ہیں۔

پوچھ مت، دیکھ کہ کیا حالِ اربیب آج بھی ہے
اپنے ہی شہر میں بیچارہ غریب آج بھی ہے
سلیمان اربیب

بیوی کا قاتل

پاکستان کی بڑی عدالت نے قتل کے ایک مقدمہ میں بیوی اور بچوں
کے قاتل باپ کو بری کر دیا ہے۔ ایک مراسلہ میں اس ظلم پر ناراضگی ظاہر کی
گئی ہے اور بڑے غصہ میں علماء ہندوستان کو پکارا گیا ہے۔
ہمارے سامنے نہ تو اس کی تفصیلات ہیں اور نہ علماء پاکستان کا
رد عمل ہے بہر حال اس سلسلہ میں اسلام کا جو فوجداری قانون ہے وہ پیش
کیا جاتا ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ اسلام کے قانون قصاص میں بلا کسی فرق دامتیار کے
انسان کی جان کی حفاظت کا مکمل انتظام کیا گیا ہے اور اس میں کوئی تخصیص و
تفریق جائز نہیں قرار دی گئی۔ النفس بالنفس (مائدہ ۴۵) جان کے
بدلے جان۔

البتہ اسلام نے دین فطرت ہونے کے تعلق سے اس قانون کو متوازن
بنانے کی کوشش کی ہے اور جان کے بدلے جان لینے میں امن عامہ کے
ملکی تقاضوں کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ مقتول کے وارثین و لواحقین کے مفاد کو

بھی ملحوظ رکھنا ہے۔ کیونکہ عادۃً قتل سے خاندان کے حالات بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس لئے اس مقدمہ کو اسلام نے قابلِ راضی نامہ قرار دیا ہے۔

اگر مقتول کے ورثاء اپنی معاشرتی اور خاندانی ضرورت کے سبب قاتل سے خون بہا (مالی تاوان) یا اخلاقی معافی کا سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوتے ہیں تو حکومت اسے تسلیم کر لیتی ہے اور اگر وہ قصاص پر اصرار کرتے ہیں تو قاتل سے قصاص لے لیا جاتا ہے۔ آج کے ملکی قانون میں سرکار مدعی ہوتی ہے۔ دونوں قانونوں میں موازنہ کرنے کا موقع نہیں جبکہ آج کے دانشور سزائے موت کو منسوخ کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں اور ہندوستان کی سپریم کورٹ نے حال ہی میں خودکشی کی ممانعت کے قانون ہی کو فوجداری تعزیرات سے خارج کرنے کا حکم کر دیا ہے لیکن اسلام کے تمام قوانین افراط و تفریط سے محفوظ ہیں۔ بیوی کے قاتل شوہر پر (مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق) تمام امت کے نزدیک قصاص واجب ہوتا ہے اور اسلام قدیم دنیا کے اس تصور کی نہایت حقارت کے ساتھ تردید کرتا ہے کہ عورت مرد کی غلام اور زرخیز ہے (کنز الدقائق ۴۴۹)۔

جو مذہب حقوق ملکیت اور حقوق عزت میں عورت کو قانونی برابری عطا کرتا ہے وہ حقوق حفاظتِ نفس میں یکے تفریق کو جائز قرار دے سکتا ہے؟ باپ اگر اولاد کو ہلاک کر دے تو اس معاملہ میں بھی اسلام اپنے معیاری انصاف پر قائم نظر آتا ہے۔

توراة ماں باپ کو یہ حق دیتی ہے، عرب جاہلیت میں بھی اسی خیال کے مطابق بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیا جاتا تھا کہ ماں باپ اپنی اولاد کے مالک ہیں۔ البتہ دنیائے قانون کے مسلمات کے مطابق اس معاملہ میں باپ کو شبہ کا فائدہ پہنچاتے ہوئے قتل کے بدلہ قتل سے بچا دیا جاتا ہے اور قاضی اسلام اس کو

تعزیری سزا دیتا ہے بالکل بری کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔

شبہ پیدا ہونے کی صورت یہ ہے کہ ماں باپ (دادا نانا بھی) کا اپنی اولاد کے ساتھ ممتا اور محبت کا جو رشتہ فطرت انسانی نے قائم کیا ہے۔ اور ماں باپ کا اولاد کے وجود میں لانے، اولاد سے بڑھاپے میں سہارا حاصل کرنے اور اولاد کے ذریعہ اپنا نام باقی رکھنے اور قدم قدم پر ان کی خیر منانے کا جو بے مثال جذبہ ان سے ظاہر ہوتا ہے اس کا تقاضا نہیں ہے کہ وہ انہیں ہلاک کرے۔

اگر خلاف فطرت ایسا ہوتا ہے تو اس میں ماں باپ کے عقلی فتور کا امکان ہوتا ہے۔

اس کا فائدہ ماں باپ کو پہنچا کر انہیں قصاص سے محفوظ رکھا جاتا ہے البتہ دوسری سزائیں جاری کر دی جاتی ہیں۔ رسول پاکؐ نے ایک موقع پر بیٹے کی باپ کے بارے میں شکایت سن کر فرمایا۔ انت و مالک لا بیک، تو اور تیرا مال۔ دونوں تیرے باپ کے ہیں۔ لیکن یہ ایک اخلاقی تاکید تھی ورنہ بیوی کے حقوق کی ذمہ داری غور پر نہ ڈالی جاتی بلکہ ماں باپ پر ڈالی جاتی۔

اولاد ماں باپ کی کفالت کے بعد اپنے مال و ملکیت میں خود مختار ہوتی ہے۔ تب ہی اس پر بیوی کے حقوق کی ادائیگی لازم ہوتی ہے۔



صوفیاء ہند پر غیر تاریخی الزام الفرقان لکھنؤ میں



پدرم سلطان بود کا غلط مظاہرہ



لکھنؤ سے شائع ہونے والے ایک موقر دینی ماہنامے (جنوری و فروری ۱۹۳۷ء) کے مدیر صاحب نے نگاہ اولین میں مسلمان کیا کریں کے زیر عنوان بغیر حوالوں کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ صوفیاء بہشت مسلم سلاطین کی فوج میں شامل رہے اور دینی اور سیاسی قائدین کے اسی اتحاد نے ہندوستان کی تسخیر کا کارنامہ انجام دیا۔

مدیر صاحب نے اپنے اس فرضی تصور کو امام حسنؑ اور امیر معاویہؓ کے اس اتحاد سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اور پھر اس مفروضہ کو دراز تر کر کے مسلم سلاطین ہند اور صوفیاء بہشت تک پہنچا دیا ہے۔

یہی وہ تصور تاریخ ہے جس کا پروپیگنڈہ فسطائی اہل قلم عرصہ سے کر رہے ہیں اور ہندو نوجوانوں کو بتا رہے ہیں کہ ہندوستان میں آنے والے ان صوفیوں نے مسلمان سلاطین کے ساتھ مل کر ہندوستان میں اسلام پھیلایا۔

بعض مسلمان اخبارات سنگھ پر یوار کے قلم کاروں پر بلا وجہ بگڑاتے ہیں اور انہیں ہندو مسلم نفرت پھیلانے کا ملزم قرار دیتے ہیں۔ جبکہ خود بعض مسلمان اہل قلم اس تصور کو بڑے فخر و مباہات کے ساتھ آج بھی پھیلا رہے ہیں یہ ایک جھوٹا گھمنڈ ہے جو پدرم مجاہد بود کی خوش فہمی کے تحت برابر ہمارے اندر جوش مارتا رہتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں مشہور عیسائی مورخ سر تھامس کا وہ نظریہ ہے جو اس نے تاریخی دلائل کے ساتھ پریسچنگ آف اسلام میں پیش کیا ہے اور انگریزوں کی تاریخی رپورٹوں کے حوالوں سے یہ لکھا ہے کہ حضرت اجمیری ہوں یا بابا فرید ہوں یا دوسرے صوفیاء ہوں جو ہندوستان کے مختلف شمالی اور جنوبی علاقوں میں آئے انہوں نے تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اسلام پھیلا یا۔ ہندوستان میں تبلیغ اسلام کا پورا باب پڑھ جائیے۔

ایک عیسائی ان صوفیاء کو داعیان اسلام قرار دیتا ہے اور اسلام کے نظریہ مساوات و اخوت کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور محض ان حضرات کی روحانی قوت اور اسلام کے نظریہ مساوات و اخوت کا نتیجہ قرار دے رہا ہے کہ ہندوستان کے مظلوم اور ستم رسیدہ طبقوں میں توحید کی روشنی پھیلی۔ اور بعض مسلمان صاحبان کا تصور تاریخ وہ ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ بعض اسلام پسند اہل قلم کو تھامس آرنلڈ کے اس نظریہ میں انگریزی ڈپلومیسی نظر آتی ہے، ان کے نزدیک انگریزوں نے اسلام کی اشاعت کو صوفیاء کرام کی روحانی اور اخلاقی کرامات سے جوڑنے کی باقاعدہ مہم چلائی تاکہ فوجوانوں کے اندر جدوجہد کا جوش پیدا نہ ہو اور وہ بھی کرامات کا انتظار کریں۔

اسے کہتے ہیں۔ دور کی کوڑی لانا۔

وہ تو ان مشائخ علیہم الرحمہ کے روحانی اخراجات سر زمین ہند میں اتنے گہرے ہیں کہ چالیس سال کے نفرت انگیز پروپگنڈہ کے باوجود اولیاء کرام کے استانوں پر ہندو مسلم اجتماعات میں فرق نہیں پڑا جس کی کوشش کی جا رہی ہے ورنہ اس زہریلے پروپگنڈہ سے شاید مساجد کے ساتھ صوفیاء کرام کی درگاہیں بھی نفرت کا نشانہ بن چکی ہوتی۔

میں مدیر صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ امام حسنؒ اور امیر معاویہؓ کے درمیان تقسیم کار کے مفروضہ کو وہیں تک رہنے دیں اور اس مفروضہ کو ہندوستان

میں لاگو کرنے کی سعی نہ فرمائیں۔

ہندوستان میں آنے والے صوفیاء کرام مسلم سلاطین کی فوج کشی کو
سہارا دینے کی غرض سے نہیں آئے، یہ نظریہ آرا ایس ایس کے گرو جی کا ہے، وہ
صوفیاء ہند کو مسلم بادشاہوں کا ایجنٹ قرار دیتے ہیں اور ہندوؤں کو
بدظن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک سلاطین ترک و تاتار کی
تعیش پسندی کے سیلاب کو روکنے کے لئے خدا تعالیٰ نے ان صوفیاء ہند کو
بھیجا۔ وہ فرماتے ہیں:

ان الشيخ بهاء الدين نصب مجدد الاحسان في الارض الترت وكان قوی البھیمة
(تفہیمات جلد ۱، ۸۶)

شیخ بہاء الدین نقشبندی کو خدا کی طرف سے تصوف و احسان کا مجدد بنا کر
ترکستان کی سرزمین میں بھیجا تاکہ وہ ترکوں میں پھیلی ہوئی حیوانی خواہشات
کو دور کریں۔

یہی صورت حال ہندوستان کے نووارد سلاطین کی تھی اور اسی مقصد
کے تحت اللہ تعالیٰ نے صوفیاء کرام کو ہندوستان بھیجا۔

ہمارا کھوکھلا جذبہ چنر مثالوں سے تسکین حاصل کر لیتا ہے لیکن اس
تسکین جذبات کے مشعلہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کتنا زہر پھیلا جاتا ہے
ہمیں اس کا احساس ہونا چاہئے۔

تاریخ کا دھارا ۴۷ کے بعد سے پوری قوت کے ساتھ جس رخ پر بہہ رہا
ہے اس کا رخ بدلنے کے لئے تسکین جذبات کا حربہ الٹا اثر پیدا کر رہا ہے۔
ضرورت اس تعمیری جذبہ کی ہے جو انکج لعلی خلق عظیم میں پوشیدہ ہے
اور اس قول نبوی میں پوشیدہ ہے: المؤمن مالف لا یموت الا یالف ولا یولف

”مومن محبت کا خزانہ ہے اور اس شخص میں کوئی تھلائی نہیں جو دوسروں سے محبت نہ کرے
اور نہ اس سے دوسرے محبت کریں۔“

مدیر محترم اسی لائن پر غور کر کے مسلمانانِ ہند کو اصلاح اخلاق اور اصلاح
معاشرہ کی دعوت دیں۔ جب ہمارے اندر (مابا نفسہم) انقلاب آجائے گا تو
پھر باہر کے انقلاب کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔
مسلمان قائدین اور مسلم عوام کو اس قرآنی پیغام کا یقین دلانا ہی مشکل ہو رہا ہے
کیونکہ اپنی کھوٹ کا احساس ہی وہ کر لوی گویا ہے جو ہمارے حلق سے نیچے نہیں اتر
رہی ہے۔

لکھنوی مدیر صاحب نے اس ادارہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے حالات کو
امت موسوی (یہودی) کے حالات پر قیاس کر کے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ جانشینانِ
پیغمبر (علا برکرام) سے یہ درخواست کریں کہ وہ ان کی سیاسی قیادت کے لئے
ایک امیر مقرر کر دیں۔ جس طرح یہود نے اپنے پیغمبر سے درخواست کر کے ایک
امیر طاوت حاصل کیا تھا۔ اور اس کی قیادت میں یہودی فتح سے ہم کنار ہو گئے تھے۔
یہ مشورہ بہت مبارک ہے۔ لیکن اس کا ایک نہایت دلچسپ اور سبق آموز پہلو یہ
ہے کہ ایک پاکستانی مفکر صاحب نے بھی اسی قسم کا اجتہاد فرمایا تھا ہو سکتا ہے
کہ لکھنوی مدیر کی نظر سے وہ گزرا ہو۔

انہوں نے حضرت طاوت کی جگہ اپنے آپ کو امیر کے طور پر پیش کیا مگر پاکستان
کے عوام نے انہیں تسلیم نہیں کیا اور وہ مایوس ہو گئے۔ تو وہ اب امام مہدیؑ کے
انتظار کی دعوت دے رہے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ ہمیں خلافت اسلامیہ
کی تحریک کو زندہ رکھنا ہے جس طرح ایک کھلاڑی دوسرے کھلاڑی کو کھیل کی شمع
دیتا ہے یہاں تک اسے آخری کھلاڑی سنبھال لیتا ہے۔ تو وہ آخری کھلاڑی
کون ہو گا۔؟ آپ سمجھ لیں اس کا نام بدحواسی ہے۔

ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ مدیر صاحب کی سوجھ بوجھ اور جوش و جذبہ کو

قائم رکھے مگر انہیں عمر نوح بھی عطا کر دے تاکہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی قیادت کے لئے علماء کرام سے ایک سیاسی امیر حاصل کرنے میں انہیں کامیابی مل جاتے اور علماء کرام کا یہ ایثار ایک تاریخی کارنامہ بن جائے۔

مدیر صاحب نے بڑے ادب سے دینی قائدین کو یہ دھکی دی ہے کہ اگر ذلتوں اور تکلیفوں سے تنگ آ کر کچھ لوگ ان حضرات سے اس طرف توجہ کی درخواست (یعنی حکم) کریں گے تو یہ بات ہرگز تعجب کی نہیں ہوگی۔

خدا کرے یہ سعادت مدیر صاحب کو ہی حاصل ہو جائے۔



فکری بھول بھلیاں



۲۴ جون کے قومی آواز میں تبلیغی جماعت کے سلسلہ میں ایک طویل مراسلہ شائع ہوا ہے، چونکہ یہ مراسلہ بظاہر ایک انفرادی مراسلہ ہے لیکن دراصل ایک مستقل مکتب فکر کی ترجمانی ہے۔ اس لئے نہایت سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ اس کا تجزیہ کرنے اور اس مکتب فکر سے وابستہ فوجوانوں کی خدمت میں اسلامی اقتدار، تحکیم بالقرآن اور مکمل دین جیسے تصورات کے ماحولی اور حال و مستقبل پر کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہے۔

مراسلہ میں مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کی کتاب نیا طوفان اور اس کا مقابلہ کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے: ”دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو، سوال یہ ہے کہ دین کو اقتدار کیسے حاصل ہو؟ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ دینی معاشرہ ہی دین کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار دے سکتا ہے۔“

ظاہر ہے کہ غیر مسلم معاشرہ یا مسلمانوں کا بے عمل معاشرہ دین کو
یعنی کتاب و سنت کو سیاسی قوت دینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک ایسی فکری بھول بھلیاں ہے جس کے اندر سے پچھلے پچاس ساٹھ برس
کی تحریکات اسلامی اور ان کے قابل احترام قائدین نہیں نکل سکے۔
دینی اقتدار کے قیام کی دو صورتیں ہیں۔ ایک جہاد بالسیف کے ذریعہ
دوسرا موجودہ جمہوری طریقہ کے مطابق ووٹنگ کے ذریعہ، پہلی صورت میں جہاد
کے لئے موجودہ معیار قوت (ایٹمی طاقت) کے مطابق ہتھیاروں کی تیاری کس طرح
کی جائے گی۔؟ اور جہاد کن لوگوں سے کیا جائے گا؟ مسلم حکمران ہاتھ پر ہاتھ
رکھے بیٹھے رہیں گے غیر مسلم حکمران کرسیاں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟
دوسری صورت میں بے عمل اور متبلائے فسق و فجور مسلمان قرآن و سنت کے
ہاتھ میں سیاسی اقتدار دے کر اپنے فسق و فجور پر پابندیاں کیسے لگوائیں گے؟
ہندستان کی تحریک اسلامی اور اس کے مرحوم قائد مولانا مودودی اس
مشن کا ایک مکمل تجربہ اپنی زندگی کے مختلف دوروں کے ذریعہ ہمارے حوالے
کر گئے ہیں۔

مرحوم دینی اقتدار کی تحریک کے مفکر تھے، مدبر تھے، عملی مجاہد تھے، مصروف
عرب کی تحریکات نے مرحوم کے افکار سے روشنی حاصل کی۔ مرحوم نے اس
تحریک کے لئے اخوان کے حسن البنا اور سید قطب شہید سے زیادہ
تحریری، تقریری اور تنظیمی اور پاکستانی حکمرانوں کے ہاتھوں قید و بند
کے مصائب اور مخالف علماء کی تنقیدوں کے حملوں کو برداشت کرنے کی
مکمل تاریخ چھوڑی ہے۔

علامہ اتبال کے الفاظ میں مودودی صاحب کی زندگی طائر لاہوتی
اور طائر ناسوتی کے دونوں منطقی دعووں اور فطری منزلوں پر مشتمل ہے۔
چونکہ ہندستان کے نوجوانوں کا ایک گروہ جماعت اسلامی کی موجودہ

پالیسی (جو مودودی کی آخری تقریر و داعی (مدرسہ ۲۶ اپریل ۱۹۴۷ء کے مطابق ڈھال دی گئی ہے) سے اختلاف کر کے ان کی شان لاہوتی کی تقلید پر ایمان بالغیب کی طرح اصرار کر رہا ہے اس لئے اس بحث کا بار بار اعادہ کر کے ان نوجوانوں کو اصلاح حال کی دعوت دینا نہ صرف اسلام کے حق میں بلکہ ملک و ملت دونوں کے حق میں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مولانا نے مدرسہ کی وداعی تقریر میں فرمایا:

”سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اس قومی کش مکش کا خاتمہ کیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اب تک برپا رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ بات (تقسیم ملک کی قومی تحریک - اخلاق) پہلے بھی غلط تھی کہ مسلمان اسلام کے لئے کام کرنے سے بجائے اپنے قومی اغراض اور قومی مطالبوں کے لئے لڑتے رہے مگر اب تو اس لڑائی کو جاری رکھنا محض غلطی نہیں بلکہ مہلک غلطی بلکہ احمقانہ خودکشی ہے (خطبہ مدرسہ ۳۲)

جن نوجوانوں اسلام پسند اہل قلم نے مودودی صاحب کے دور اول کی کتابوں کو حفظ کر رکھا ہے اور ان کی اصطلاحوں اور ان کی انتہا پسندانہ تعبیروں میں وہ آج کے ہندوستان میں اپنے خیال کے مطابق اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔ کیا وہ مودودی صاحب کے اس مشن کو نقصان نہیں پہنچا رہے جو ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی نے پورے شعور کے ساتھ اختیار کر لیا ہے کیا جس قومی کش مکش سے مودودی صاحب نے دور رہنے کی تلقین کی تھی۔ اسی قومی کش مکش کو عین اسلام سمجھ کر اور اسے جہاد اسلامی کا نام دے کر اپنے قائد کی تصویر کو بگاڑنے کی مہربانہ کوشش نہیں کی جا رہی جس طرح حسین ابن علی کی شہادت کو سبائی گروہ نے اپنے مذہب و سیاسی اغراض کے لئے استعمال کیا اور کربلا کی تاریخ مسخ ہو کر رہ گئی۔

یہ بات خوشی کی نہیں۔ ماتم کی ہے

ہم ہندوستانی مسلمانوں کو خوشی ہوتی کہ پاکستان میں ابوبکر و عمر کی خلافت راشدہ قائم ہو گئی ہے اور وہاں اسلام کے اجتماعی عدل اور سماجی اور معاشی مساوات کا بول بالا ہے اور پھر ہم اس سچے جمہوری نظام کو پیش کر کے ہندوستان کی قیادت سے مطالبہ کرتے کہ وہ پاکستان کی قیادت کو تسلیم کرے۔ لیکن ہمیں پاکستان کے موجودہ حکمرانوں کی گراؤٹ نے شرمندہ کر رکھا ہے۔ جس مفکر اسلام نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں (دسمبر ۱۹۴۳ء) اسلامی حکومت کے موضوع پر بولتے ہوئے یہ کہا تھا:

”وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوا ہو گا۔ اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہوگی۔ جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے (تاریخ جماعت اسلامی ۴۵۸) اس شدت پسندانہ تجزیہ کے باوجود مرحوم نے پاکستان کی قومی حکومت کے ساتھ تعاون کو تسلیم کر کے انتخابی سرگرمیوں میں شرکت اختیار کر لی اور ماچھی گوٹ پنجا ب کے اجلاس شوریٰ ۵۷ء میں اصولی موقف سے ہٹ کر قومی موقف قبول کرنے کی ضرورت کو اسلام کا تقاضا ثابت کرنے کے لئے مرحوم نے چھ گھنٹے خطاب فرمایا اور پھر بھی شوریٰ کو اپنے استعفیٰ کی دھمکی دینی پڑی اور اس تجویز کو منظور کرایا۔

مودودی صاحب نے مسلم قومی حکومت کے بارے میں اسلام کا راستہ روکنے کی جو بات کہی تھی وہ سو فی صدی صحیح ثابت ہو رہی ہے۔
 کیا ہندوستان کے احیاء پسندوں جو ان تحریکِ اسلامی کے اس آثارِ چڑھاؤ سے کوئی سبق لیں گے؟

اور ہندوستان ہندو اکثریت کی مذہبی فرقہ پرستی کے خلاف جو جدوجہد کر رہا ہے اور سپریم کورٹ نے ہندوستان کے دستور کے ساتھ سیکولرزم، مذہبی رواداری اور ثقافتی احترام کو جس مدلل طریقہ پر جوڑا ہے اس کے پیش نظر اپنے طائرِ لامہوتی والے نظریات میں اعتدال پیدا کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو ذہنی انتشار اور شکوک و شبہات کا بھڑکنا بننے سے بچائیں گے۔

محترم علی میاں صاحب ہمیشہ ایک جامع اور مکمل بات فرماتے ہیں۔ مراسلہ نگار محولہ بالا کتاب پر غور کر کے اسلامی اقتدار کے حصول کا طریقہ (ہندوستان میں) کیا ہو؟ اس کی تفصیل سے آگاہ کریں گے؟ انتظار رہے گا۔

ہمارے سامنے اس کا جو حل ہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے اندر موجود ہے اور وہ یہ ہے آپ نے ایک دینی معاشرہ تیرہ سال کی لگاتار دعوتی، اخلاقی جدوجہد اور بے مثال صبر و تحمل، بے مثال نظم و ضبط کے ذریعہ قائم کیا۔

پھر اس دینی معاشرہ کو خدا تعالیٰ نے مدینہ منورہ میں صاحبِ اقتدار کر دیا، یہ سیاسی اقتدار نہ جہاد و تلوار کا ممنون تھا۔ اور نہ کسی سیاسی تحریک کا شکر گزار تھا۔

آپ کے ہاتھ میں کوئی سیاسی قوت نہ تھی۔ ساری قوت باطل کے ہاتھ میں تھی۔ جس کے آخری حملہ سے بچنے کے لئے حضورؐ نے ہجرت فرمائی۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی یہ بتاتی ہے کہ آپ کا پہلا دور شان جمالی کا تھا اور دوسرا شان جلالی کا تھا، جسے ہم ناسوتی اور لاہوتی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

لیکن آج کے قائدین اسلامی اس ترتیب کے فطری اور مسنون ہونے کے قابل معلوم نہیں ہوتے۔

علامہ اقبال نے مسلمانوں کے سیاسی دور اقتدار کے ختم ہونے کے بعد انہیں پھر مسنون ترتیب کے مطابق کام کرنے کی دعوت دی تھی اور کہا تھا کہ

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

اب فاضل مراسلہ نگار غور کریں کہ تبلیغی جماعت درخت کی جڑ ہے یا درخت کے پتے ہیں؟ یہ جماعت مسلم معاشرہ کو اس قابل بنارہی ہے کہ وہ آزمائش کے موقع پر اسلام کا ساتھ دیں۔ اپنی اغراض کا ساتھ نہ دیں۔ اس مقصد کے لئے اس کا زور ارکان خمسہ اسلامی کی تعلیم و تربیت پر ہے۔ اس جماعت کے اکابر کو اسلام کے دین کامل ہونے کا پورا شعور حاصل تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ رسمی مسلمانوں کا ابنوہ (بقول مودودی صاحب) اور تربیت یافتہ مسلمانوں کی بھی آزمائش میں اسلام کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

اس لئے ان کی جدوجہد کا سارا زور مکی زندگی کے تربیتی پروگرام پر ہے اور یہی زور اور توجہ تمام صوفیاء ربانی کے ہاں ملتی ہے۔

ایک چیز مکمل ہوتی ہے مگر اس میں بھی فطری ترتیب نظر آتی ہے دعوت دین کا کام بھی ترتیب چاہتا ہے۔ عالمی طور پر مسلم معاشرہ کا حال انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ اس سلسلہ میں الاخوان کے مشہور قائد سید قطب شہید نے

معالم الطريق میں بڑے تجربہ اور دلیل کی بات کہی ہے وہ یہ ہے۔

”سیاسی اقتدار ایمان و عمل پر خدا کا انعام ہے شرط نہیں ہے۔ ایمان و عمل کی کتنی مقدار پر اور کتنی میعاد پر یہ انعام نازل ہو گا۔ یہ سراسر خدا کی مصلحت پر موقوف ہے۔“

قرآن کریم (النور ۵۵) میں خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان و عمل صالح پر خلافت عطا کرے گا۔ اور وہ انعام الہی ہو گا۔

ہمیں تو جلد بازی نے پریشان کر دیا ہے بس یہ چاہتے ہیں کہ کوئی پکٹی پکائی کھلائے بلکہ سیاسی اسلام کے پاکستانی رہنماؤں نے اب مایوس ہو کر قرب قیامت کی پیشین گوئیوں سے سہارا لینا شروع کر دیا ہے اور ایک عالمی اسلامی انقلاب کے لئے امام مہدی کے ظہور کی روایات بیان کی جا رہی ہیں۔

جو حضرات فطری اور تعلیمی ترتیب کے خلاف کھیتی باڑی کئے بغیر باقر خانی کھانا چاہتے ہیں وہ فطرت اور سنت دونوں سے بغاوت کرتے کے سبب ناکام رہے ہیں اور اسی کی جھنجھلاہٹ ہے کہ جس نے عالمی طور پر مسلمانوں کے ایک طبقہ کو تشویشناک خطرات کا حامل قرار دیدیا ہے۔

وعظ کہنے اور کتابیں لکھنے کی حد تک مکمل دین اور اخلاقی الدین کا نہ کا پیغام ٹھیک ہے لیکن اگر تبلیغی جماعت بھی انخوانی تحریکوں کی طرح اے تحریکھے صورت دیدیتی تو اس کا وہی حشر ہوتا جو انخوانی اور ان جیسی تحریکوں کا ہوا اور ہو رہا ہے۔ پاکستان کے اس تجربہ سے نائدہ اٹھایا جائے کہ مسلم حکمران، ملان دولت مند اور خواص و عوام اسلام کو بڑے بڑے چنڈے دے سکتے ہیں۔ پریس لگواسکتے ہیں ادارہ کھلوا سکتے ہیں، جہازوں میں دورے کروا سکتے ہیں لیکن ووٹ نام کی کوئی چیز اسلام کے ڈبہ میں نہیں ڈال سکتے۔

اور جوش میں آکر کوئی ہتھیار اٹھالے تو پھر اس کا زن بچہ کو لہو پلوا دیتے ہیں یا ان کا رخ کسی غیر مسلم ملک کی طرف پھیر دیتے ہیں اور دوسروں کے

ہاتھوں انہیں پکٹی میں پسوا دیتے ہیں۔

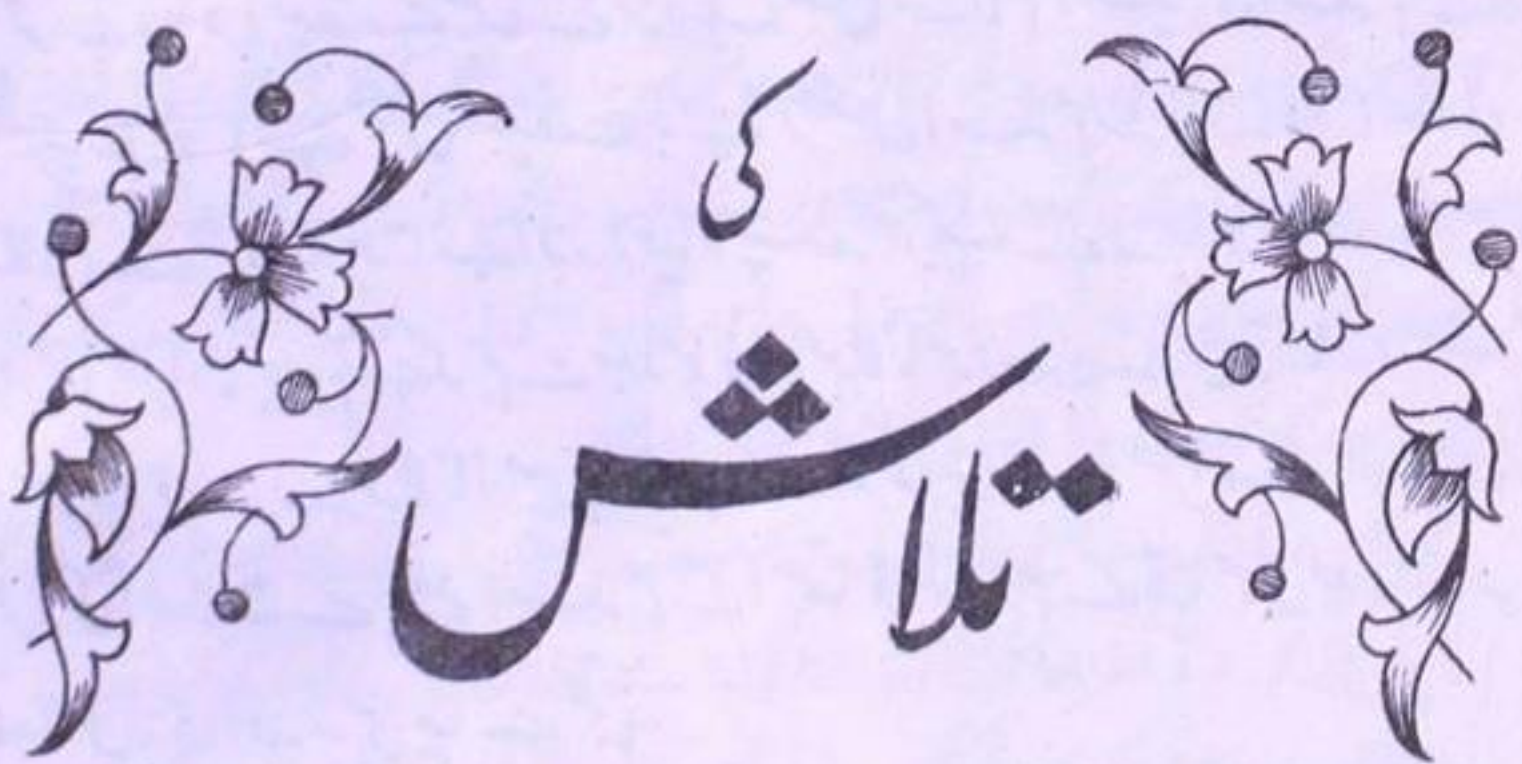
تبلیغی جماعت دین کی ٹھیکہ دار نہیں

جماعت اسلامی کے لوگ کہتے ہیں کہ تبلیغی جماعت مکمل اسلام کی تبلیغ نہیں کرتے، یہ وہ طبقہ ہے جس کے نزدیک مکمل اسلام، سیاسی اسلام، سے شروع ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکمل اسلام روحانی اور اخلاقی نظام سے شروع ہوتا ہے اور احیاء پسند تحریک کے رہنماؤں کو اب اس امر کا اعتراف ہو رہا ہے کہ ہم سے جلد بھڑی۔ مولانا مودودی کے رفیق کار ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا امین احسن اصلاحی برملا یہ اعتراف کر رہے ہیں کہ فرد کی اصلاح سے پہلے اسلام کے اجتماعی نظام کے قیام کی جدوجہد لا حاصل رہی اور رہنی چاہئے تھی۔

تبلیغی جماعت بنیادی ارکان اسلامی کے دائرہ میں فرد کی اصلاح کا کام کر رہی ہے لیکن وہ یہ دعویٰ نہیں کرتی نہ کر سکتی ہے کہ دین کا کام بس یہی ہے اور اسے کافی سمجھا جائے، نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ دین کے معاشرتی اور معاشی احکام کی تبلیغ کا دائرہ وسیع ہے اور اس دائرہ میں دوسری جماعتیں کام کریں انہیں اس فرض کی ادائیگی سے کون روکتا ہے؟

چنانچہ علماء کرام کا ایک طبقہ دینی مدارس چلا رہا ہے، اور اب مسلم جماعتوں نے اصلاح معاشرہ کی تحریک شروع کی ہے، یہ تحریک ہنی عن المشکر کی تحریک ہے، اس میں شادی بیاہ کی مذموم رسموں کی تردید کی جاتی ہے، اس کے ساتھ حلال و حرام کے اسلامی احکام کی تبلیغ پر بھی اس میں توجہ دینی چاہئے۔ اور یہ کام یعنی منکرات، سود، جوا، شراب، کے خلاف زبان کھولنا واقعی اس دور میں جہاد کے برابر ہے۔

ہندوستانی پرچار



سیکولر مغل اعظم اپنے آپ کو بدلیں

قرآن کریم نے آخری الہام ہونے کی حیثیت سے سابق مذاہب اور سابق مذہبی قوموں کے ساتھ جس رواداری اور مشترک اصول دین میں باہمی موافقت کی ہدایت کی اور علماء اسلام نے اس قرآنی ہدایت کے مطابق ہندوستان کی قدیم الہامی کتابوں (ویدا اور پُران) میں روحانی اور اخلاقی تعلیمات کی روشنی کا اقرار اور اعلان کیا اس پر پچھلے مضامین میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے لیکن ہوا یہ کہ انگریزی غلامی کے دور میں برطانوی سامراج نے ہندوستان کے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے علماء کے درمیان مناظرہ بازی کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ان مناظروں اور مباحثوں میں مسلمان عیسائی، آریہ سماجی اور سناتن
دھرمی علماء اور پنڈت صاحبان ایک دوسرے کے مذہب اور مذہبی کتابوں کو
بالکل بے حقیقت اور سچائی سے مکمل طور پر خالی ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

مسلمان مناظروں کو اس کا خیال نہیں رہتا تھا کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں
ویدوں اور پرانوں کے بارے میں البیرونی سے لے کر شاہ عبدالعزیز صاحب
محدث دہلوی، حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور فاضل شہناشہ الہی پتی تک
ان علماء محدثین اور صوبہ ربابی نے کس وضاحت کے ساتھ تسلیم کیا ہے کہ
توحید، نبوت اور آخرت کے بنیادی تصورات میں (بھگورے فرق کے ساتھ)
تمام مذہبی کتابیں وید، پران، تورات، انجیل اور قرآن کریم ہم زبان ہیں، اور
اسی طرح ہندو مہاشے اور پنڈت صاحبان نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ
ویدوں اور پرانوں نے انتم رشی اور کلکی اوتار کے نام سے کتنے صاف
صاف اشاروں کے ساتھ حضرت محمد خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی
کا اعلان کیا اور بھوشیہ پران (مستقبل کی خبریں) بیان کرنے والے پران
میں برہما جی پر اتری ہوئی پیشین گوئیوں کو پنڈت وید پرکاش جی نے اپنی
حسن ترتیب کے مطابق چار ہزار سال پہلے انتم رشی کے باپ کا نام ماں کا
نام، مقام پیدائش، معراج، ہجرت اور فتح مکہ اور دفاعی قوت سے شیطانی
اثرات کے خاتمہ کی خبروں کو کتنا قابل فہم اور ناقابل تردید بنایا۔

دونوں طبقوں کے اہل علم پرانگریزوں کے سیاسی سحر کا اثر تھا اور
انگریزوں نے دونوں کو ایک دوسرے سے اتنا خائف اور دہشت زدہ
کر دیا تھا کہ رات دن ایک دوسرے کے اندر کیڑے نکالنے میں لگے رہتے تھے
تحریک آزادی کے علماء اسلام اور ہندو رہنما مناظرہ بازی کی
تحریک کے خلاف تھے لیکن جو تحریک منافرت سیاسی اقتدار اور مالی خدمت کے

ذریعہ چل رہی تھی اس کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا، اسی دوران مشہور ہندوستانی
مصلح پنڈت دیانند جی سرسوتی کی تحقیقی کتاب سستھیار تھ پر کاش میں چودھوا
باب شامل کیا گیا۔

حالانکہ ہر موٹی عقل رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ جو مصلح مور تہی کھنڈن
کے قصور کی وجہ سے سنا تن دھرم والوں کے حملوں سے بچنے کے لئے مسلمانوں
میں پناہ لیتا تھا اور مسلمان زمیندار انہیں ہر قسم کی حفاظت دیتا کرتے تھے وہ
اسلام پر ایسی دلخراش نکتہ چینی کیسے کر سکتا تھا؟

اسی دور غلامی میں انگریزوں کی سرپرستی میں آریس ایس کی بنیاد
پڑی اور گرو جہاراج نے ہندو ازم کو ویدوں اور پرانوں کی دگر سے ہٹا کر
خالص اسلام اور مسلم منافرت میں بدل دیا، ملک آزاد ہوا، ہندو مسلم منافرت کی کھیتی
اس کے کسان نے خوب کاٹی اور ایک ملک کے دو حصے الگ الگ ہو گئے۔

آزادی کے بعد تحریک آزادی کے سرفروش رہنماؤں نے ملک کی تقسیم
سے ہمت نہیں ہاری اور ہندوستان کو ایک اتحاد پرور سیکولر قوت
بنانے کا فیصلہ کیا۔

گرو جہاراج کی مذہبی منافرت پھیلانے والی تحریک میں تقسیم کی وجہ سے
شدت کا پیدا ہونا ایک فطری عمل تھا مگر گاندھی جی اپنے مشن کی قوت سے
اڑے آئے پھر گاندھی جی نے اپنی جان کی قربانی دے دی گرو جہاراج
کی تحریک منافرت کا مقابلہ ہر سطح پر شروع ہوا۔ سیاسی سطح پر کانگریس
کے علاوہ مسز سجدرا جوشی جی کی سا پر داکیتا ورودھی کمیٹی نے کانفرنس
کیں، اور بڑے پیمانے پر تردیدی لٹریچر پھیلا یا۔

اس تحریک کو جمعیتہ علماء ہند کے طبقہ کی پوری اخلاقی اور مالی حمایت جاری
رہی۔ اس سرفروش خاتون پر حملے ہوتے رہے اور ایک حملہ میں ان کے
سر کی بڑی توڑ دی گئی، اب وہ مجاہد خاتون بڑھاپے اور کمزوری کے

ساتھ خانہ نشین ہیں اور ان کے سکرٹری مسٹر گوئل فرقہ پرستی کے خلاف قلمی جہاد میں مشغول ہیں۔

اس مجاہد خاتون کی قسربانیوں کو شاید لوگ بھول جائیں مگر تاریخ کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس خاتون نے فرقہ دارانہ فسادات کی آگ بجھانے کے لئے سردھڑ کی بازی لگانے اور گاندھی جی کے مشن کو زندہ رکھنے کی وہ کوشش کی ہے جو اس خاتون کو دنیا کے امن پسندوں کی صفِ اول میں جگہ دے گی۔

مذہبی سطح پر آزاد ہندوستان کے ضمیر نے ہندو علماء کی ایک بلند پایہ علمی جماعت کو کھڑا کیا اس جماعت کی قلمی و کالت پنڈت وید پرکاش اپادھیائے پنجاب نے کی اور پنڈت جی نے اپنے مستند علم سنسکرت کی مدد سے اور اس دور کے فاضل پنڈتوں پر و فیسر سرسوتی پرشاد چترویدی الہ آباد یونیورسٹی اور سوامی رامانند سرسوتی جی کی ہدایت پر ۱۹۶۹ء میں ہندی میں دو کتابیں لکھیں اور ان کتابوں میں نہایت تحقیق کے ساتھ ویدوں اور پرالوں سے انتم رشی، کلکی اوتار اور تراشمنس کے بارے میں جو پیشین گوئیاں موجود تھیں انہیں پیش کیا اور ثابت کیا کہ ان تمام واضح اشاروں اور علامتوں کے مصداق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔

ان تحقیقات پر الہ آباد، بنارس اور مرزا پور کے ۸ مستند سنسکرت علماء کی تصدیقات درج ہیں۔

ضرورت تھی کہ جس قوت کے ساتھ گرو جی کا خود ساختہ ہندو ازم پھیل رہا تھا اسی قوت سے ہندو دھرم کی اصلی تصویریں اور مسلم عوام میں پھیلائی جاتی مگر اس پر توجہ نہ دی جاسکی اور جس قوت کے ساتھ علمائے اسلام نے توریت اور انجیل کی پیشین گوئیوں کی تحقیق و اشاعت میں محنت کی اس کے برابر بلکہ اس سے زیادہ محنت اس کام پر کی جاتی بنیادی مواد موجود تھا، مسلمان علماء سنسکرت کی اس موضوع پر کتابیں موجود

تھیں، پھر پنڈت وید پرکاش کی تحقیقی کاوش و جود میں آگئی تھی، اس کی روشنی میں وسیع پیمانے پر کام کیا جاتا۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کے تسلسل نے مسلمانوں کو ناامیدی کی طرف دھکیل دیا۔ اور مسلم رہنماؤں کو امدادی کاموں سے فرصت نصیب نہ ہوئی، آزادی کے بعد عملی طور پر کام کا میدان جمعیتہ علماء ہند کے ہاتھ میں تھا، اس درویش صفت جماعت کے ارکان آخر کس کس طرف دوڑتے؟ کام کرنے کے ہر شعبہ میں امکان کی حد تک کام کیا گیا، لیکن فساد قوتوں نے میدان مار لیا اور آج جو صورت حال ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

اب کیا ہو؟

اس مختصر تمہید کے بعد اصل مسئلہ یہ ہے کہ بارہ پندرہ کروڑ مسلمانوں کا بے قیادت زندگی گزارنا نہ صرف ان کے لئے باعث شرم ہے بلکہ ہندوستان کے حق میں بھی خطرناک ہے۔

اس بے قیادت اور بے قید زندگی کو قیادت کے نظم و اتحاد میں لانا ضروری ہے اور بابری مسجد کی تحریک میں جن افراد نے مسلمانوں کے جذباتی ہونے اور خوفزدہ ہونے سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو ناامیدی کے اندھیروں میں دھکیل دیا وہ اب ایکشن کمیٹی اور رابطہ کمیٹی کے ڈھانچوں سے علیحدگی اختیار کر کے نئے ڈھانچے تشکیل دے کر وہی نہریت شدہ افراد قیادت کے اسٹیج پر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سوال افراد کا نہیں، ذاتی طور پر تمام افراد محترم ہیں، سوال اس بیمار اور استحصال پسند ذہنیت کا ہے جس نے مسلمانوں کو زیر دست نقصان پہونچایا، مسلمانوں کو قیادت کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمن کی قائم کردہ لائسنوں پر واپس لوٹنا ہے۔

مولانا آزاد نے لکھنؤ میں مسلمانوں کو یہ واضح لائن دی تھی کہ مسلم جماعتیں

اپنی سرگرمیوں کو دینی تعلیم اور مسلم معاشرہ کی اصلاح کے بنیادی کاموں میں مشغول رکھیں یہ کام بھی بہت بڑا ہے، البتہ یہ لوہے کے چنے چبانے کا کام ہے، حکومت کے خلاف ایک دھواں دھار تقریر سے مسلمان واہ واہ کے نعرے بلند کرتے ہیں اور جب معاشرہ میں تیزی کے ساتھ پھیلنے والے اخلاقی فساد پر کچھ کہا جاتا ہے تو مسلمان منہ بنانے لگتے ہیں لیکن علماء و مشائخ سے آخرت میں پہلا سوال یہ ہو گا کہ جو دین کی خدمت تمہارے بس میں تھی اور جس کے وسائل تمہیں حاصل تھے تم نے اس سلسلے میں کیا خدمت انجام دی؟ رہا معاملہ مسلمانوں کے شہری حقوق کی جدوجہد کا تو اس میں مولانا معاملہ غم غیر مسلموں کے ساتھ مل جل کر جدوجہد کرنا فروری قرار دیتے تھے، علیحدہ سیاست کو نقصان دہ سمجھتے تھے۔

قیادت کے دو امیدوار

اب ہماری قیادت کے امیدواروں میں دو طبقے سرگرم نظر آ رہے ہیں ایک وہ طبقہ جو سنگھ پرپوار کے بارے میں یہ فرض کر چکا ہے کہ ہندو عوام کے نمائندہ یہی لوگ ہیں اور جو یہ فرض کر چکا ہے کہ سنگھ پرپوار کی ہندوئیت اور قومی دھارا ہی حقیقی ہندو ازم ہے اور جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندوئیت نام ہے مسلمانیت کی دشمنی کا، ہندو پن کی تصویر قدیم مذہبی تصورات میں نہیں بلکہ گرو جی کے بیچ تھائش میں ہے، تو اس طبقہ کا مسلمانوں سے یہ کہنا اس مفروضے کی بنیاد پر درست ہے کہ مسلمان سنگھ پرپوار کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ جائیں اور نہ صرف اپنی ملی غیرت کو کھنکھادیں بلکہ اپنے وطنی رشتہ اخوت کے ساتھ بھی غداری کریں۔ یہ دعوت محترم مولانا وحید الدین خاں صاحب کتنے ہی فلسفانہ دلائل کے ساتھ پیش کریں۔ بہر حال ناقابل عمل ہے۔ اسی طرح وہ ذہن بھی ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح ملکی اور ملی رہنمائی کے لائق

نہیں جو آج کے خوفناک حالات میں بھی مسلمانوں کی یہ دعوت دے رہا ہے کہ آؤ! مسلمانوں! دنیا میں شریعت قائم کرنے کی جدوجہد میں ہمارے ساتھ آجاؤ، تمہاری کامیابی اسی میں ہے۔ (افکار ملی اوکھلا)

یہ نعرہ فنڈ اکٹھا کر سکتا ہے، لیکن بخر یہ بتا رہا ہے کہ ہندو راشٹر کی تحریک کا جواب اسلامی حکومت کے قیام کا نعرہ نہیں ہے، یہ قیادت نہیں بلکہ تصادم ہے اسے آسانی کے ساتھ غیر ملکی سازش قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ دے دیا گیا ہے۔

بقول مولانا مودودی مرحوم اس قسم کے نعروں سے آزاد ہندوستان میں جاری حاند ہندو قومیت کو قوت حاصل ہوگی۔ (آخری خطبہ مدراس ۱۹۴۴ء) اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اور روسی اتحاد کے بعد امریکہ جیسے دوست ملکوں نے بھی اس نعرہ کو اسلامی دہشت گردی کا نام دینا شروع کر دیا ہے۔

مولانا آزاد کے نظریہ کی طرف واپس لوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے اس حقیقت کا اعتراف کیا جائے کہ ہندوستانی پر یو آر محض ایک خواب و خیال نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے، کمزور ضرور ہے۔ لیکن محض وہم نہیں ہے۔ مذہبی رواداری کا جو جذبہ قرآن کریم نے دیا ہے وہی جذبہ وید اور پران کی قدیم تعلیمات میں بھی موجود ہے اور اس کی ترجمانی کرنے والے افراد ہندو سنتوں اور صوفیوں میں موجود ہیں۔

سیاسی لیڈروں کی صفیں بھی ایسے افراد سے بھری پڑی ہیں، ہندو دانشور اور جدید تعلیم یافتہ ہندو طبقہ بھی اس امن پسند اور روادار فکر سے خالی نہیں ہے، لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ ہندوؤں میں ایسے سیکولر افراد ہوں جو اپنے آپ کو ہندو کہتے ہوئے شریعت میں اور ہم ایسے پکے مسلمان ہوں کہ کھیل کود کے میدانوں میں بھی مسلمان ٹیم کے جیتنے پر نعرہ بکیر بلند کریں۔ یعنی ہمارا کھیل بھی اسلامی ہوا اور سیکولر ہندوؤں کا دھرم بھی سیکولر ہو، اور ہندو ایسے پکتے

سیکولر ہوں کہ مندروں میں ماتھے ٹیکتے نظر نہ آئیں اور ہم ایسے چمکے نمازی ہوں جو ضرورت پڑنے پر سرکاری سڑکوں پر چٹائیاں اور مصلے بچھا کر نماز ادا کریں تو یہ بے انصافی ہے اور اس کا کبھی عملی طور ممکن نہیں۔

مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ مسلمان جس مذہبی آزادی کو اپنا حق سمجھتا ہے اسے وہ حق دوسروں کے لئے بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہی قرآن کی تعلیم ہے۔ حق اور ناحق کا فیصلہ آخری فیصلہ کے دن ہو گا، دنیا کی زندگی میں لا اکراہ فی الدین کا قانون فطرت کا اٹل تقاضا ہے۔

سیکولر مغل اعظم

صحیح اور قومی مسلم قیادت کے قائم ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ سیکولر حکمرانوں کی مغل شاہی حکومت ہے جو ۲۰ - ۲۵ سال سے اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔

یوں سمجھئے کہ مسلمان چچی کے تین پاٹوں میں پس رہا ہے، موہن جراحی صاحب کشمیر کا رونا روتے ہیں، لیکن یہ سارے ہندستان کا رونا ہے۔

اور اس کا حاصل یہ ہے کہ فرقہ پرستوں کی کوشش یہ ہے کہ مسلمان ملک گیر سطح پر نمبر ۲ کے شہری بن کر رہیں اور ہمارے سیکولر حکمرانوں نے شروع دن سے (پنڈت نہرو کا دور مستثنیٰ ہے) یہ کوشش کی کہ مسلمان قومی پارٹیوں اور قومی اداروں کے اندر خوشامد پسند اور ہاں جی ہاں جی اکرنے والے نمبر ۲ کے ممبر بن کر شریک رہیں۔

لے لوٹ آدمی کھرا اور کڑوا ہوتا ہے۔ بے ایمان آدمی ہی خوشامد پسندی کر کے اپنا الو سیدھا کرتا ہے، ملک اور دیش کا مفاد چوٹے میں جائے

ملک کے مفاد پر خاک پڑے اس کے ہوس کا پورا پڑ جائے۔

سیکولر حکمرانوں نے حکومت کے اندر اور قومی لیڈروں نے قومی پارٹیوں

کے اندر کھرے آدمیوں کو برداشت نہ کیا اس کے نتیجے میں کھرے آدمی پسپا

ہو کر کنارے بیٹھ گئے اور کھوٹے آدمیوں نے خالی میدان پر قبضہ کر لیا۔

قومی لیڈروں کے اندر چھپا ہوا مغل اعظم ایماندار مسلم قیادت کو تباہ

کرتا رہا اور اپنی قرعہ خونی انا کی تسکین پر دیش کی بھلائی کو قربان کرتا رہا۔

آج مسلمانوں کی فلاح سے تعلق رکھنے والا کوئی سرکاری اور نیم سرکاری

ادارہ ایسا نہیں جو ان مغل شاہی سیکولر لیڈروں کی خوشامد پسندی کی نذر

نہ ہو رہا ہو۔ یہ لوگ اپنی خدمات کا صلہ اپنے ہم پیالہ اور ہم نوالہ مسلمان ساتھیوں

کو سرکاری کمیٹیوں وقف اداروں اور الیکشن سٹنکٹوں کی شکل میں دیتے ہیں۔

دلی راجدھانی ہے، راجدھانی کی کانگریس کمیٹی کا مسلم حلقوں میں کیا

اثر ہے؟ اسے چل پھر کر دیکھئے۔ دلی کے بے تاج بادشاہ کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ لوگ

ہر عہدہ پر براجمان نظر آئیں گے جن کا عوام پر اتنا اثر بھی نہیں ہے کہ وہ کسی

حلقہ میں کارپوریشن کی سیٹ بھی نکال سکتے ہیں۔

پھر مسلمانوں سے شکایت ہے کہ وہ کانگریس سے دور ہیں۔ یہ حال تمام

ہندوستان کے قومی اداروں کا ہے جو مغل شاہی سیکولر لیڈروں کی خوشامد

پسندی کا ماتم کرتے کرتے تھک چکے ہیں۔ اس جمہوری نظام میں اگر واقعی

جمہوری ہے (کسی بڑے سے بڑے وزیر اعظم کو اس بات کا کیا حق پہنچتا ہے

کہ وہ مسلم اقلیت کی نمائندگی کے لئے اپنی ذاتی پسند کے لوگ نامزد کرے

اور انہیں مسلم عوام پر زیر دستی مسلط کرے۔

اگر سیکولر لیڈر اپنی یہ ذہنیت نہیں بدلتے تو ہندوستانی پر یوار کا نقشہ

مکمل نہیں ہو سکتا اور ملک میں ابتری کی جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے اس

کی ذمہ داری سے یہ لوگ بچ نہیں سکتے۔

اگر ہمارے سیکولر لیڈروں کا منشا یہ ہے کہ حکومت کے اندر
اور پارٹیوں میں مسلم عوام کی چیخ و پکار کی نمائندگی کرنے والا کوئی نہ ہو تو یہ چیخ
و پکار صحیح راستہ نہ ملنے پر غلط راستہ تلاش کرے گی۔ سیلاب کا پانی
بند باندھنے سے نہیں رکتا۔ پھر وہ آبادیوں کو روند ڈالتا ہے۔

مسلم قیادت پر نکتہ چینی کرنے والے اگر ایماندار ہیں تو وہ اس پہلو کو
نظر انداز کیوں کرتے ہیں؟ بارہ کروڑ آبادی بے قیادت نہیں رہ سکتی
اگر اسے مرکزی اور صوبائی نظم نہ ملا تو پھر ہر گلی کوچے اور ہر گھر میں ایک قائد ہوگا
سہ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

نالہ پا بند نے نہیں ہے

اور یہ انتشار ہے، بد نظمی ہے، افراط فری ہے جس میں بڑی بڑی مضبوط حکومتیں
بالآخر خاک چاٹنے لگتی ہیں لیکن ہم مسلمانوں سے پھر یہی عرض کریں گے کہ وہ
ان تمام حوصلہ شکن حالات کے باوجود آگے بڑھیں۔ صحیح سمت میں آگے بڑھیں۔
مثل مشہور ہے کہ گنتے گنتے بھول جاؤ پھر گنتے لگو۔ باری مسجد کا حادثہ
بہت بڑا المیہ سہی، ایک قیامت سہی جو سر سے گزر گئی لیکن زندگی اور زندگی کے
مسائل اصلی قیامت تک چلتے رہیں گے۔ اب ہمیں پچھلے تجربات کی روشنی سے فائدہ
اٹھا کر سندھوستانی پر یوار کی صفوں میں جگہ بنانی ہوگی۔

ہندوستانی پر یوار پر اعتماد کرنا ہوگا اور انہیں اعتماد میں لے کر جدوجہد
جاری رکھنی ہوگی۔ مسائل کے حل میں دیر سویر ہو سکتی ہے خدا کے ہاں بھی دیر ہے اندھیر
نہیں ہے۔ پھر یہ تو عالم اسباب ہے۔؟

کانگریسی حکومت کے ساتھ منفی اور انتقامی جذبہ سے نہیں بلکہ نظریاتی و ثوق کے
ساتھ ملک کی سیکولر جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ چلنا پڑے گا قومی لیڈروں نے ہم مسلمانوں
کے بارے میں یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ لوگ کانگریسی حکومت سے بیزار ہو کر ہمارے ساتھ چلیں گے یہ حیثیت
بے حیثیت کر رہی ہے ہم پر اعتبار نہیں کیا جاتا الیکشن میں کام نکالا جاتا ہے اور پھر دھتائی

مولانا مودودی

کی قیادت کے دو دور



مولانا مودودی صاحب مرحوم کی قائم کردہ جماعت "جماعت اسلامی" اب پرانے منجھے ہوئے لوگوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے اور وہ لوگ سامنے آ رہے ہیں جن کو مودودی صاحب کے مکمل مطالعہ میں بہت وقت لگے گا۔ اور مرحوم کی قیادت کے مختلف دوروں اور مختلف آثار چڑھاؤ کو سمجھنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں اس سے بھی زیادہ وقت کی ضرورت پڑے گی۔ ذیل میں مودودی صاحب کی قیادت کے دو نمایاں دور واضح کئے جا رہے ہیں۔

مودودی صاحب کی قیادت کے دو دور تھے۔ پہلا دور خالص نظریاتی دور تھا جس میں مرحوم نے اسلامی نظام کو اصولی طور پر واضح کر کے پیش کیا اور مغربی تہذیبی عروج کے سیلاب سے نوجوانانِ ملت کی حفاظت کا فرض ادا کیا۔

اسی دور کو مولانا آزاد کے دور الہلال سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مودودی صاحب نے خلافت کے اصولی افکار کو نکھارنے اور واضح کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ ماضی کے حالات پر تنقید کی۔ مولانا آزاد کو جب اس نکھار اور امتیاز کی ضرورت پڑی تو مولانا نے مسئلہ کی

۸۱

اس کے علاوہ مرحوم مودودی صاحب نے تنقیدی لٹریچر نے امت کے مختلف فرقوں کے اندر جماعت اسلامی کے لئے جو غم و غصہ بھر دیا ہے اس سے جماعت کے دعوتی کار کو زبردست نقصان پہنچ رہا ہے۔

تحریک ختم نبوت

مودودی صاحب نے اپنی اصولی اور نظریاتی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے جمہوریت اور الیکشن کے ذریعہ عوامی فتویٰ حاصل کرنے کی راہ کو پوری ایمانداری کے ساتھ قبول کیا۔ چنانچہ ختم نبوت کی تحریک کو مودودی صاحب غلط سمجھتے تھے اور قادیانی مسئلہ کو دستوری اور جمہوری طریقہ پر حل کرنے کی رائے رکھتے تھے۔ مگر مجلس احرار اسلام اور جمعیتہ علماء ہند (مدنی گروپ) نے اس مسئلہ کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس تحریک میں وہ جوش و خروش پیدا کیا کہ مودودی صاحب کو عام مسلمانوں میں جماعت اسلامی کے قوم سے کٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اور مرحوم بادل ناخواستہ مجبوراً تحریک میں شریک ہوئے۔

(سید مودودی ص ۱۳۶)

اور پھر بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ختم نبوت کی تحریک کے نتیجہ میں پاکستانی سیاست کا وہ معجزہ نمودار ہوا کہ قادیانیوں کو ایک الگ غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ اور اس کا سہرا درحقیقت مجلس احرار اسلام اور جمعیتہ علماء ہند کے شعلہ بار خطیبوں اور جفاکش مجاہدوں کے سر بندھا۔ تحریک کی شرکت اور پھالشی کی سزایابی کی سعادت میں جماعت اسلامی اور مودودی صاحب شامل ضرور ہو گئے۔

جماعت اسلامی کشمیر

صدر ایوب خاں کے دور میں جب کشمیر کے مسئلہ پر لڑائی چھڑی تو

تھے کہ تحریک اسلامی۔ اسلام کے نام پر بنے ہوئے ملک میں خود مسلمانوں کی بوفانی سے ختم ہو گئی۔

تحریک اسلامی کا قائد ناکام نہیں ہوا۔ بلکہ مسلم قوم فیل ہو گئی۔ ماچھی گوٹ کے اجتماع میں مودودی صاحب نے چھ گھنٹے اپنی زندگی کی طویل ترین تقریر کی اور اس میں یہ واضح کیا کہ میں نے تحریک اسلامی کے ہر مرحلہ میں اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ تحریک اسلامی پر امن ذرائع پر یقین رکھتی ہے۔ تشدد اور جارحانہ سرگرمیاں تحریک سے کوئی جوڑ نہیں رکھتیں، اس لئے پاکستان میں قیادت کی تبدیلی کے لئے پُر امن جدوجہد کا راستہ ضروری سمجھتا ہوں، مولانا اصلاحی ہوں یا دوسرے اہل علم، تحریک اسلامی کو تحریر و تقریر اور جلسوں اور اجتماعات کی سرگرمیوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے اور عام مسلمانوں کے فتوے سے شکست کی ندامت برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے مودودی صاحب نے اس لحاظ سے ایک باہمت عملی رہنما کا عہدہ کر دار پیش کیا۔ میں مودودی صاحب کے بعض ناقدین کے اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ مودودی صاحب نے تحریک آزادی کے دور میں آزادی کی متحدہ جدوجہد سے مسلمانوں کو الگ رکھنے کے لئے اسلام کے نام پر یہ تحریک برپا کی اور جب پاکستان بن گیا تو پاکستان کی قومی ریاست ہی کو اسلامی ریاست کے برابر سمجھانے کی کوشش شروع کر دی۔ میں اس بدگمانی کو واقعات کے خلاف سمجھتا ہوں۔

ہندوستانی مسلمانوں کو نصیحت

مودودی صاحب تحریک اسلامی میں انگریز کے آلہ کار ہوتے تو ہندوستانی مسلمانوں کو وہ نصیحت نہ کرتے جو موصوف نے اپنی آخری تقریر (مدراس اپریل ۴۴ء) میں کی۔ سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اس قومی کشش مکش کو ختم کیا جائے جو

کرنے کے لئے موجودہ دور کی پرامن اور آئینی جدوجہد الیکشن کا راستہ اختیار کیا جائے اور پاکستانی عوام سے فتویٰ حاصل کیا جائے۔ موقف کی تبدیلی کا مسئلہ جماعت اسلامی کے تاریخی اجتماع ماچھی گوٹ، ۵۷ء کے اندر زیر بحث آیا۔

اس بحث مباحثہ کی رپورٹ اسعد گیلانی صاحب کے الفاظ میں یہ ہے "۱۹۵۷ء میں وہ اندرونی فتنہ اٹھا جو جماعت کے نظم کو داخلی طور پر سال بھر تک جھنجھوڑتا رہا، جماعت کے بعض ذمہ دار رفقاء میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جماعت نے سیاست میں حصہ لے کر غلطی کی ہے اور اسے تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کا کام ہی ایک مدت تک سراسر انجام دینا چاہئے تھا۔

۱۹۵۶ء کے دستور پاکستان کے تحت عام انتخابات قریب تھے۔ اس سلسلے عرصہ میں مولانا مودودی پر سخت ذہنی اور فکری پریشانی اور اضطراب طاری رہا۔ اس اجتماع ارکان نے جماعت کی سابقہ پالیسی (انتخابات میں شرکت کا فیصلہ) کی توثیق کی اور افسوس ہے کہ بعد میں اس پالیسی سے اختلاف رکھنے والے جماعت سے مستعفی ہو گئے۔ (۱۷ء) یہ حضرات تعداد میں ایک سو کے قریب (علماء و زعماء) تھے جن میں مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ شامل تھے۔

مولانا مودودی نے اپنے حق میں یہ فیصلہ استعفیٰ کی دھمکی دے کر منظور کرایا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مودودی صاحب پاکستانی عوام کی مذہبی بے عملی کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھے؟ حالانکہ ۱۹۵۱ء کے پہلے الیکشن سے ۱۹۷۱ء کے الیکشن تک مودودی صاحب کو برابر شکست ہوتی رہی اور مرحوم اس کے باوجود اسلامی خلافت کے لئے بقول اپنے رواجی مسلمانوں سے فتویٰ حاصل کرتے رہے یہ کسی غلط فہمی کے سبب نہیں تھا۔ بلکہ مرحوم نظریاتی اسلامی حکومت کی قلمی اور تقریری جدوجہد کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ وہ تھکے ہارے مسافر کی طرح قرار داد مقاصد کے سایہ رحمت میں آرام کرنا چاہتے تھے۔ اور تاریخی یہ ثابت کرنا چاہتے

نزاکت کے پیش نظر بڑی احتیاط سے کام لیا۔

ایک پاکستانی مفکر جو پہلے جماعت اسلامی کے سرگرم رہنما تھے۔

مولانا مودودی صاحب کے دورِ اول کا تجربہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

” ان کی انتہا پسندی کا اولین منظر یہ تھا کہ انہوں نے متحدہ قومیت کو

نہایت شروء کے ساتھ کفر قرار دیا۔ اور کانگریسی مسلمانوں اور جمعیتہ علماء ہند

اور اس کی قیادت پر نہایت جارحانہ ہی نہیں، حد درجہ دل آزا راہ تنقید میں

کیں اور پھر کچھ عرصہ بعد انہوں نے مسلم قومیت (مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے نظریہ)

کو بھی کفر بواح (یعنی کھلے کفر) کا ہم پلہ قرار دے دیا۔ (میشاق لاہور ۱۹۹۰ء)

یہ پہلا دور مسلم لیگ کے دو قومی مطالبہ کی کامیابی کے بعد، ۱۹۴۷ء میں ختم ہو گیا

کیونکہ مودودی صاحب ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے گئے اور اسلامی حکومت

کی نظریاتی گرمی اور جوش کا اصل نشانہ (ہندو قوم) سامنے سے ہٹ گئی

تھی اور مسلم قوم سے اسلامی قومیت کی جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

دوسرا دور

مسلم لیگ کے ہوشیار لیڈروں نے مذہبی رہنماؤں سے (جو تحریک

پاکستان کے آخری دور میں ان کے پیچھے لگ گئے تھے) اپنا پیچھا چھڑانے

کے لئے قرار داد مقاصد کے نام سے ایک تجویز پاس کرادی۔ مولانا مودودی

صاحب نے اس قرار داد کو خدا کی طرف سے ایک عظیم اکرام و النعام قرار

دے کر پاکستان کو خلافتِ اسلامیہ کے برابر سمجھ لیا اور اسے اس قدر اہمیت

دی۔ بقول سید اسد گیلانی صاحب کے ”مولانا مودودی نے قرار داد مقاصد

پاس ہونے پر اس ملک (پاکستان) کو مسجد کی مانند قرار دیا جسے اسلامی نظام

کے لئے وقف کر دیا گیا ہو۔ (سید مودودی ص ۱۲۳)

اس دوسرے موقف کا حاصل یہ تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اب تک برپا رہا ہے۔ میرے نزدیک یہ بات پہلے بھی غلط تھی کہ مسلمان اسلام کے لئے کام کرنے کے بجائے اپنے قومی اغراض اور مطالبوں کے لئے

لڑتے رہیں مگر اب تو پاکستان بننے اور تقسیم ہند کے بعد اس لڑائی کو جاری رکھنا محض غلطی نہیں بلکہ مہلک غلطی اور احمقانہ خودکشی ہوگی۔
(تاریخ جماعت اسلامی ص ۱۳۲)

فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلہ میں ہندوستانی مسلمانوں کو ہدایت کی۔
(۱) ہم صرف مدافعت میں شریک ہوں گے، اگر مسلمان زیادتی کریں تو ہم ان کا ساتھ نہیں دیں گے۔

(۲) مسلمان اسلامی حدود کی پابندی کریں۔ مثلاً عورتوں، بچوں، بیماروں، ضعیفوں اور مسافروں پر حملہ نہ کریں۔

(۳) لڑائی کے بعد پکڑ دھکڑ اور مقدمات میں بھی اسلامی قیود کی پابندی کریں، اگر مسلمان جھوٹی گواہیاں دینے لگیں اور بے گناہوں کو پکڑوانے لگیں تو ہم ان مسلمانوں سے الگ ہو جائیں۔ (ایضاً)

ایک دعوتی اور تبلیغی تحریک کو قومی تعصب فرقہ وارانہ فرسیت اور سیاسی نکتہ چینی سے کتنا نقصان پہنچتا ہے؟ اسعد گیلانی صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مودودی کی سوانح حیات میں لکھا ہے۔

”بلکہ یہ قومی تعصبات میں شدت اور بانی جماعت (مودودی صاحب) کی کانگریس پر سخت سخت تنقید کے سبب غیر مسلموں میں دعوت کے اثرات بہت کم پھیلے۔ (ص ۲۸۷)

ہندوستان کی جماعت اسلامی افسوس ہے کہ اپنے بانی وقائد کی اس آخری نصیحت (جو درحقیقت نصیب العین ہے) پر قائم رہنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ کیونکہ اسے مسلم عوام سے بھی اپنا ربط و تعلق قائم رکھنا تھا

مودودی صاحب نے اس اہم نازک مسئلہ میں اپنے اصولی اسلامی موقف کا اظہار کیا۔ مودودی صاحب اس وقت پاکستان کی قومی سیاست کے ایک اہم رکن بن چکے تھے، لیکن کشمیر کا جہاد ایک اہم اسلامی اصول سے ٹکرا رہا تھا۔

اسد گیلانی کے الفاظ میں

”جہاد کشمیر کے بارے میں حکومت کا طرز عمل دو عملی پر مبنی تھا۔ ظاہری معاہدے اور داخلی لڑائی۔ مولانا کا اصولی موقف یہ تھا کہ حکومت کو ہندوستان کے ساتھ کیسے ہوئے معاہدوں کو ختم کرنے کا اعلان کر کے کشمیر پر جہاد چھیڑنا چاہیے۔“ (ص ۱۳۶)

اسلام مغربی ڈپلومیسی (مکاری، نفاق اور دو عملی) کو برداشت نہیں کرتا، اسلام صلح و جنگ کے تمام معاملات کو دو ٹوک صفائی اور صدق دلی کے ساتھ حل کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

مودودی صاحب کی اس خالص اصولی رائے پر مرحوم کے خلاف طوفان برپا ہو گیا۔ بڑے بڑے درجہ کے اہل علم و تقویٰ بزرگ مصلحت بینی کا شکار رہے اور مرحوم مودودی صاحب نے اپنی جان اور اپنی جماعت کے وجود کو خطرے میں ڈال کر اسلامی اصول پر استقامت کا مظاہرہ کیا۔

پاکستان کی جماعت اسلامی کے موجودہ رویہ کو اگر دیکھا جائے تو وہ ایک خالص سیاسی جماعت کی روش پیش کر رہی ہے اور جہاد کشمیر کے نعرہ بازی میں مشغول ہے اور اسے اپنے قائد مودودی صاحب کے سابق طرز عمل (معاہدہ ہوتے ہوئے نعرہ جہاد کا عدم جواز) کے مقابلے میں مسلم ووٹوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی زیادہ فکر ہے۔

امید ہے کہ اندھے جوش و جوش کو اسلام سمجھنے والے تحریک اسلامی کے قائد محترم کی قیادت کے مختلف دوروں کو جو احوال و ظروف

کی شرعی رعایت کے تحت وقوع میں آئے غور سے دیکھیں گے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

مسلمانان ہند کی قیادت اسلامی کی تاریخ میں یہ بات بھی دلچسپ لطیفے کے طور پر ثبت رہے گی کہ مودودی صاحب نے سن ۱۲ کے مولانا آزاد کو ۲۱ء میں مرحوم قرار دے کر ان کے چھوڑے ہوئے مشن کی تکمیل کا دعویٰ کیا۔ اور پھر مودودی صاحب کے رفیق خاص ڈاکٹر اسرار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی پاکستان نے اپنے قائد مودودی صاحب کے متعلق لکھا کہ ۲۱ء کے مودودی صاحب سن ۱۵ء میں اپنی زندگی ہی کے اندر مرحوم ہو گئے تھے۔ اور ان کے چھوڑے ہوئے مشن کی تکمیل کے لئے میں کھڑا ہوا ہوں۔

نیا دور

قومی نہیں انسانی ہے

مولانا مودودیؒ اور مولانا وحید الدین خاں کے دو انتہا پسندانہ نظریے

نیا دور کے عنوان پر مولانا وحید الدین خاں صاحب کا ایک فکر انگیز مضمون پڑھا یہ ناچیزان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کسی مضمون یا کسی کتاب پر محترم خاں صاحب کا نام دیکھتے ہی آگ بگولا ہو جاتے ہیں اور مولانا کے مسلم ماضی سے متعلق انتہا پسندانہ افکار مشوروں کے پیش نظر موصوف کی تحریر کے فکر انگیز اور سبق آموز پہلوؤں کو بھی ناقابل توجہ فرار دیتے ہیں۔

اس مضمون میں مولانا نے ایک یہ بات بنیادی فرمائی کہ آزادی کے بعد قائدین کرام نے فکر جناح اور فکر اقبال کی دو قومی تھیوری کے خلاف کوئی مثبت جوابی تحریک (قومی اتحاد اور متحدہ قومیت) برپا نہیں کی اور اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کی سوچ کا صحیح رخ متعین نہیں ہو سکا۔

مولانا نے اس کی ذمہ داری مولانا آزادؒ، مولانا مدنیؒ اور مولانا حفیظ الرحمنؒ اور

وران کے ہم خیال قائدین پر عائد کی یہاں تک کہ مولانا آزاد اور ان حضرات کے بارے
 میں یہ لکھ دیا کہ یہ حضرات ۱۹۴۷ء کے بعد غیر فعال بن گئے اور انہوں نے مسلمانان ہند کو
 نئے حالات کے اعتبار سے کوئی واضح رہنمائی نہیں دی۔

اس حقیقت کے اظہار سے تو شاید مولانا ناراض نہیں ہوں گے کہ موصوف
 کی زندگی کا کافی حصہ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی تحریک اسلامی اور جماعت
 اسلامی کے ساتھ گہری وابستگی میں گزرا ہے اور ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی
 مسلمان جن آزمائشوں سے گزرے وہ دور یا اس دور کا کافی حصہ حکومت الہیہ
 کے قیام کی تحریک میں خاں صاحب کی شرکت کا رہا ہے۔

پھر کسی وجہ سے موصوف کی منفرد تحریری صلاحیت نے اپنی الگ شناخت
 ہم کی اور تعبیر کی غلطی کے نام سے ایک اچھی کتاب تصنیف فرمائی اور تحریک
 اسلامی سے علیحدگی اختیار کر لی۔

میں نے موصوف محترم کو قریب سے جب دیکھا جب صدر جمعیتہ علماء ہند مولانا
 ابوالاعلیٰ عظیم گڑھ سے الجمعیتہ کے جمعہ ایڈیشن کی ادارت کے لئے دہلی لائے۔

مولانا کو الجمعیتہ کی ادارت تفویض کرنے کا مقصد یہی تھا کہ مولانا احتجاجی
 حلقوں سے الگ ہٹ کر مسلمانوں کے اندر تعمیری ذہن کی آبیاری کریں۔

مولانا نے اپنے آزاد ادارتی دور میں متحدہ قومیت کے مشن کو کس حد تک
 پورا کیا اور اس میں کتنی کامیابی حاصل کی؟ اس کا اندازہ خود مولانا کو ہو گا۔

ہمیں تو یہ معلوم ہے کہ خان صاحب نے اس مشن پر توجہ دینے کے بجائے
 مولانا مودودی کی ضد اور عناد میں ایسا فلسفہ ایجاد کیا کہ خدا کا مکمل دین صلح
 اور مسیحیہ کے تابع نظر آنے لگا۔

مودودی صاحب نے اپنے علمی انا کے زور میں یہ دعویٰ کیا کہ پچھلی چودہ
 صدیوں میں اسلامی احیاء کی تحریک صرف جماعت اسلامی کی تحریک ہے۔
 اس کا بانی (مودودی صاحب) ہیں ہوں۔ خاں صاحب نے اس کے برعکس یہ

دعویٰ شروع کیا کہ چودہ سو برس کے اندر اسلامی اجتماعیت کے قیام کی جس قدر
کوششیں ہوئیں وہ سب نہ صرف لا حاصل بھتیں بلکہ ان سے اسلام کو
نقصان پہونچا۔

دونوں قلم کار دو مخالف سمتوں میں دوڑے اور دونوں ہی نے اسلام
اور اکابر اسلام کی تصویروں کو بگاڑنے کی متعصبانہ جدوجہد کی۔
جمعیتہ علماء ہند کے قائدین نے جب تاریخ کی اس تحریف کاری کو دیکھا
تو خاں صاحب کو ادارت سے الگ کر دیا، مودودی صاحب مرحوم نے آخر میں
رجوع کر لیا اور خاں صاحب کو ابھی تک رجوع کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔
یہ بات بڑی مضحکہ خیز ہے کہ مولانا آزاد کو غیر فعال ثابت کرنے میں جماعت
اسلامی کے اہل قلم اور خاں صاحب محترم دونوں شریک ہیں۔ فرق
دونوں میں یہ ہے کہ جماعت اسلامی والے یہ کہتے ہیں کہ آزادی کے بعد مولانا
آزاد غیر فعال ہو گئے اور ۱۹۴۷ء کے الہلال والبلاغ کی دعوت سے منہ
موڑ لیا حالانکہ اس دعوت کا وقت وہی تھا اور خاں صاحب کے نزدیک
مولانا کی بے عملی اس معنی میں ظاہر ہوئی کہ مولانا متحدہ قومیت کے اپنے نظریہ
پر کوئی تحریک نہ چلا سکے اور گھر بیٹھے رہے۔

میرے تم سے ہی رہتے ہو

کیا شرارت ہے خیر خواہ کے ساتھ

اب اس الزام کی حقیقت پر غور کیجئے۔ ہندوؤں کے بارے میں خان صاحب
لکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں مسٹر جناح کے فکر کا رد عمل ہوا۔ اور وہ بھی ہندو
اور مسلمانوں کو دو قومیں تسلیم کرنے لگے۔ یہ بات نہیں۔

حقیقت یہ ہے قومی اتحاد کے علمبردار کانگریسی رہنماؤں نے ملک
کی تقسیم مان کر متحدہ قومیت کے تصور پر ایک کراری چوٹ ماری اور
متحدہ قومیت کا تصور عام لوگوں میں صرف ایک خیال خام بن کر رہ گیا۔

مولانا نے متحدہ قومیت کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ میں
ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار نہیں ہو سکتا، ہاں ہندوستان کی آزادی
سے دست بردار ہو سکتا ہوں۔

تقسیم کا فیصلہ مولانا کی رائے کے خلاف ہوا اور خان عبدالغفار خاں سرحدی
بمبئی ہندوستان سے رخصت ہوئے کہ ہم اسے ساتھ کانگریس نے بے وفائی
اور مولانا عطار اللہ شاہ بخاری احراری قائد مولانا احمد سعید صاحب
نے اسے یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ لے بھائی! بنیے نے ڈنڈی مار دی، ہم چلے۔

اس متحدہ قومیت کو ایک تحریک کے طور پر چلانا بچوں کا کھیل نہیں تھا
ہندوؤں کا مذہبی جنونی طبقہ یہ کہتا تھا کہ بھارت ماتا کی تقسیم کے بعد متحدہ قومیت
ایک مردہ لاش ہے، اس لاش پر سیکولرازم کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

ہندوستان میں سیکولزم آئین کی ترتیب اور سیکولر نظام کی تشکیل
متحدہ قومیت کو دوبارہ زندہ اور نافذ کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ضرور
کے زبانی مگر اس کی مزاحمت میں جو طاقت و تحریک برپا ہو چکی تھی اس کا مقابلہ سیکولر
پانڈین نہ کر سکے، کیونکہ سیکولرازم عوامی دلوں کا محتاج تھا اور دلوں
میں بھاری اکثریت ہندوؤں کی ہے۔

اس کے باوجود آزاد اور مدنی قیادت نے دو قوم کی بھتوری کو بے اثر
رہنے کے لئے قومی اتحاد کے لئے جو ہمہ جہت جدوجہد کی وہ خدا جانے
خاندان صاحب سے کیوں پوشیدہ رہی؟

ہاں متحدہ قومیت اور قومیت وطنی کا لغو لگا کر اور اس مسئلہ کے
نظری پہلوؤں کو موضوع بحث و فکر بنا کر ایک رسمی کی قسم کی تحریک نہیں
نے چلائی گئی اور نہ فرقہ وارانہ فسادات کے قیامت خیز منہگاموں اور فرقہ پرستی
کے متعدد ذہنی اور مذہبی حملوں کی یلغار میں اس کا کوئی موقع تھا۔

ان حالات میں سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ قومی اتحاد کو عملاً پارہ

کرنے والے حالات کو روکا جائے اور حکومت کی کمزور اور مصلحت کو شش سیکو
پالیسی سے مسلمانوں کے اندر مایوسی نہ پھیلنے دی جائے۔

اس بات کا کیا تک تھا کہ ملک میں فرقہ پرستی کی آگ برس رہا ہو اور
علماء کرام متحدہ قومیت کے نظریہ کی افادیت بیان کر رہے ہوں، حالات دو
قومی نظریہ کی تائید کر رہے ہوں، اور علماء کرام اس نظریہ کی صداقت پر
تحریک چلا رہے ہوں؟ — علی طور پر ان تائیدین نے متحدہ قومیت کا بھرم
قائم کرنے کے لئے اپنی عزیز جانیں کھپا دیں، مسلم قوم کی خون پسینے کی کمائی
چاروں طرف سے سمیٹ کر مظلوموں کی مدد میں صرف کی۔

کیا یہ بے عملی تھی؟ — متحدہ قومیت کا بازاروں میں خون بہہ رہا تھا۔ قومی اتحاد
کے لاشے ترپ پڑے تھے، کیا ان کو گورو کھن نہ دیا جاتا؟ اور کیا قومی اتحاد کی
تحریک چلانے کی ذمہ داری تنہا ابوالکلام آزاد اور مولانا مدنی کی تھی۔ جن کے
ہاتھ میں نہ مالی وسائل تھے اور نہ انتظامی قوت تھی صرف ایک حسہ حال قوم تھی
اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس جنونی دور میں آزاد اور حفظ الرحمن اور
ان کے رفقاء تنہا نہیں لڑ رہے تھے۔ بلکہ ان کے شانہ بشانہ گاندھی جی کے
چیلے تھے، خود گاندھی جی اوپر بیٹھے تھے اور اپنی جان عزیز قربان کر کے چلے
گئے۔ اور مسز سبھدرا جوشی، مسز مردولا بہن، پنڈت سندر لال وغیرہ قسم کے
مخلص اتحاد پسند مرد اور عورتیں سینکڑوں کی تعداد میں متحدہ قومیت میں دوبارہ
جان ڈالنے میں سرگرم عمل رہے۔

لیکن حکومتی طبقہ فرض سے غفلت برت رہا تھا اور اس طرح آج تک یہ
متحدہ قومیت فرقہ وارانہ فسادات کے حملوں سے نیم جان بنی ہوئی ہے۔

حال صاحب موجودہ حالات میں واضح رہنمائی کی بات کرتے ہیں موصوف
بغیر مطالعہ کے صرف اپنے ذاتی مزعومات کی بنا پر نکتہ چینی کرنے میں منفرد شہرت
حاصل کر چکے ہیں۔ ورنہ انہیں یاد رہتا کہ آزاد اور مدنی قیادت نے لکھنؤ

کا نفس میں کیا فیصلہ کیا تھا؟ کیا اس سے زیادہ واضح رہنمائی ہو سکتی ہے؟

قومی اتحاد کے قیام کی اس عملی جدوجہد کے ساتھ وطنیت اور ہم وطنی کا شریعت اسلام کی روشنی میں واضح مطلب پیش کرنے کے سلسلہ میں علماء حق نے چند بنیادی کام انجام دیئے۔ مولانا آزاد نے معارف اعظم گڑھ کے مدیر مولانا معین الدین ندوی کو توجہ دلائی کہ وہ شریعت کی روشنی میں ہندو مسلم تعلقات کی وضاحت کریں۔

ندوی صاحب نے ستمبر ۱۹۵۲ء کے معارف سے یہ بحث شروع کی اور متقدمین علماء کی تصریحات پیش کر کے ہندوؤں کے قدیم مذہب کو اصلاً توحیدی مذاہب میں داخل کرنے کا فیصلہ پیش کیا جس فیصلہ کی رو سے ہندو مشابہ اہل کتاب قرار پاتے ہیں اور مشرکین عرب کے بارے میں قرآن کریم نے جو احکام دیئے ہیں اور مسلم لیگ کی طرف سے ان کا ہدف ہندوؤں کو قرار دینے کی جو کوشش کی گئی ہے اس کی مکمل تردید ہو جاتی ہے۔

اس بحث کی تفصیل راقم السطور نے مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت کتاب میں نقل کی ہے۔

اس کے علاوہ جمعیتہ علماء ہند کے ناظم اور ہندوستان کے مفتی اعظم مولانا محمد میاں صاحب نے دستور ہند کو ایک معاہدہ قرار دے کر ہندو مسلمان اور تمام ہندوستانی قوموں کو امن و آزادی کے عہد و پیمیاں کا پابند قرار دیا اور فقہی اصطلاح میں ہندو مسلمان معاہدہ قرار دیئے گئے۔

یہ قومی اتحاد کے لئے بنیادی کام تھا۔ پھر موجودہ بین الاقوامی دور کے تقاضہ کو محسوس کر کے ہندوستان کے مشہور عالم اور مفتی مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے خلیفہ اور پاکستان کے مفتی اعظم مولانا

محمد شفیع صاحب نے اپنے شیخ کے حوالہ سے یہ اعلان کیا کہ دنیا کے جس حصہ میں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ پُر امن سماجی زندگی گزار رہے ہیں وہ عہد عملی کی صورت ہے اور مسلمان اپنے غیر مسلم پڑوسیوں (ہندو، عیسائی وغیرہ) کے ساتھ سماجی اعتماد کی وجہ سے امن و سلامتی کے ساتھ رہنے کے پابند ہیں۔

مولانا تھانوی کے اس اجتہاد نے (جو قرآن کریم پر مبنی ہے) قدیم فقہی اصطلاحوں دار الحرب اور دار الاسلام اور حربی اور ذمی کی تمام بحثوں کو ختم کر دیا اور مسلمانوں کو تمام غیر مسلم ملکوں میں ایک انسانیت نواز اور امن پسند گروہ کے طور پر متعارف کرانے کا شرعی راستہ کھول دیا۔ یہ ناچیز علماء کرام سے درخواست کرتا ہے کہ وہ مجالس حکیم الامت مطبوعہ کراچی ص ۸۵ کا بغور مطالعہ فرمائیں اور اسی کے ساتھ سورہ العام آیت ۱۰۸ کی سیر حاصل علمی اور فقہی تحقیقات تفسیر معارف القرآن تصنیف مفتی محمد شفیع صاحب جلد سوم ص ۲۱۷ اپنے مطالعہ میں رکھیں تاکہ ہم سب محترم دینی قائدین کرام کا ذہن کھلے اور وہ موجودہ بین الاقوامی دور کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی تشریح و توضیح کا حق ادا کرنے کے قابل ہوں۔

یہ وہ علماء حق ہیں جنہیں ہر مکتب فکر کے علمی حلقے اعتبار و اعتماد کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مولانا آزاد کی تفسیر و مضامین کا حوالہ اس لئے نہیں دے رہا کہ مولانا اپنے سیاسی مسلک کے سبب ایک طبقہ کی نظریں معتبر نہیں مانے جاتے۔

عملی طور پر آزادی کے بعد لکھنؤ کانفرنس کا اقدام مسلمانان ہند کو موجودہ حالات میں واضح رہنمائی دینا نہیں تھا تو کیا سمجھا؟ لکھنؤ میں مولانا آزاد نے مسلم جماعتوں اور مسلمان قائدین کے اتفاق سے یہ فیصلہ کیا کہ ہر مسلم جماعت دینی دائرہ میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے گی اور مسلمانان

ہندسیاسی اور شہری معاملات میں ملک کی قومی جماعتوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کریں گے اور اس طرح مسلمانوں کے مسائل صرف ان کے فرقہ وارانہ مسائل نہیں رہیں گے بلکہ قومی مسائل کا ایک حصہ بن جائیں گے۔

لیکن مولانا آزاد کی رہنمائی میں کہے گئے۔ اس فیصلے کو ہندوستان کے حالات میں ٹھہراؤ آجانے کے بعد بزدلی کہا جانے لگا اور بابر کی مسجد تحریک کی کراری چوٹ نے آنکھیں کھولیں اور اب مسلم قائدین کو لکھنؤ فیصلہ کی روشنی نظر آ رہی ہے خاں صاحب نے اس مضمون میں قوم اور وطن کی بحث چھیڑی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاں صاحب باوجود دعویٰ تجدد اور ترقی کے پچاس سال پہلے کے دور میں سائنس لے رہے ہیں۔

حالاں کہ آج دور ہے اس سوال کیا کہ انسان اور وطن کا باہمی رشتہ کیا ہے؟ علماء حق نے دین فطرت کی روشنی میں اس کا جواب دیا ہے کہ انسان رنگ و نسل اور خاندان و وطن کی حد بندیوں سے بلند ہونے کے باوجود وطن سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ وطن ہی کی سر زمین انسان کو پروان چڑھاتی ہے، وطن ہی کے تعاون سے انسانیت کے جوہر نکھرتے ہیں۔ دین فطرت نے انسانی ہمدردی کی پہلی منزل وطن کو قرار دیا ہے جو انسانی زندگی کی پہلی سیڑھی ہے۔

حدیث پاک میں ہدایت کی گئی ارجو امن فی الارض یوحکم من فی السماء (مکواۃ ص ۴۲۳) (ترجمہ) مسلمانو! اہل زمین پر مہربانی کرو۔ آسمان والا تم پر مہربانی کرے گا۔ یہ اہل زمین اہل وطن ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے۔ یہ اہل زمین ایران و توران کے باشندہ نہیں بلکہ اپنے اہل محلہ، پھر اپنے اہل شہر اور پھر تمام ہندوستانی باشندے ہیں۔

قرآن کریم انسانی ہدایت کا آخری پیغام ہے اس نے وطنی رشتہ کو پڑوسی کے فطری رشتہ سے تعبیر کر کے ہم نشینوں اور زندگی کے ساتھیوں کے

ساتھ حسن سلوک کرنے کی ہدایت کی۔ (سورہ فہار)

علامہ اقبال مرحوم نے قوم اور وطن کی بحث کو اس کے سیدھے سادے مطلب سے ہٹا کر اسے نیشلزم کی مغربی اصطلاح کا لباس پہنا دیا اور وطن کو تازہ خداؤں میں سے ایک خدا قرار دے کر بات کا بتنگڑ بنا دیا حالانکہ دینِ فطرت (اسلام) میں وطن خدا نہیں ہے مگر خدا کا بڑا انعام و اکرام ضرور ہے۔ اسلام نے وطن کو مذہب کا ظاہری مددگار اور مذہب کو وطن کے لئے اخلاقی روشنی قرار دیا۔ حدیث پاک کی تعبیر میں وطن آخرت کی کھیتی ہے فرمایا گیا الدنیا مزرع الآخرة اس استعارہ سے بہتر دنیا (وطن) آخرت (دین) کے باہمی تعلق کو سمجھانے کی دوسری کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ وطن کے تعاون سے مسجدیں، خانقاہیں اور مدرسے بنتے ہیں جن میں مسلمان خدا کی عبادت کرتے ہیں وطن کے تعاون سے مسلمان اہل استطاعت (صاحب حیثیت) بنتے ہیں اور مکہ اور مدینہ کی زیارت کا فرض ادا کرتے ہیں۔

یہ وطن کا تعاون ہی ہے جو ایک تاجر اور محنت کش کی صلاحیت کو بار آور کرتا ہے اور اسے اہل وطن کی رفاقت حاصل ہوتی ہے۔

وطنی تعاون (سرکاری نوکریوں کے علاوہ) کے یہ فائدے کسی سمجھدار مسلمان سے پوشیدہ نہیں لیکن اس کا کیا حل ہے کہ فرقہ پرستوں نے آنادی کے بعد ایک دن بھی مسلمان رہنماؤں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور مسلمانوں میں وطن دوستی کے احساسات کی آبیاری کا موقعہ نہیں دیا گیا۔

میں خاں صاحب کے اس تجزیہ سے کلی طور پر اتفاق نہیں کر سکتا کہ موجودہ مسلم قیادت بارش اور بے ریش (دارھی والے مولوی اور دارھی منڈے مسٹر) دونوں مسٹر جناح کے قیادتی انداز کی توسیع ہیں۔

صرف اس حد تک اتفاق ضرور ہے کہ تحریک تقسیم کے جراثیم زدہ ذہن ابھی کچھ موجود ہیں لیکن یہ زیادتی ہے کہ خاں صاحب تمام موجودہ قائدین کو

ایک لکڑی ہانک رہے ہیں۔

صورت یہ ہے کہ مسلمانوں پر جب بھی فرقہ پرستوں کی طرف سے کوئی ذہنی اور جسمانی چوٹ پڑتی ہے تو لوگ مسٹر جناح کو یاد کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مسٹر جناح صحیح کہتے تھے کہ ہندو مت نہیں کھا جائیں گے، اور کچھ نادان آج تک مولویوں کی جان کو روٹے ہیں کہ اگر یہ پاکستان کی مخالفت نہ کرتے تو پاکستان دہلی تک بنتا۔ کوئی حد ہے اس نادانی کی؟

لیکن ان خیالات کو دور کرنے کے لئے مسلمان قائدین کو ایک دن کی مہلت تو نصیب ہوتی اور مسلمانوں پر فرقہ پرستی کے تاثر توڑ چلے کسی وقت تو کمزور پڑتے؟ وہ تو مسلمانوں کے پندرہ کروڑ کی تعداد میں ہونے کا خوف اس طبقہ پر اتنا طاری ہے کہ وہ کسی وقت بھی اطمینان کا سانس نہیں لے سکتے۔

خاں صاحب کوئی تدبیر ایسی بتائیں کہ مسلمان اپنے سارے شہری حقوق سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دیں اور اس کے بدلے میں ان کی جان اور مال کو عافیت نصیب ہو جائے اور یہ آواز کالوں میں آئی بند ہو جائے کہ پاکستان بن گیا مگر یہ ۱۲-۱۵ کروڑ مسلمان اب بھی ہمساری چھاتی پر مونگ دل رہے ہیں۔

ہندو مسلم منافرت مسٹر جناح کا فکری تسلسل نہیں ہے یہ برطانوی راج کی سازش کا تسلسل ہے۔ مسٹر جناح نے پاکستان بننے کے بعد اپنی تقریریں دو قوموں کی تھیوری کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ مگر انگریزوں نے اپنے پیچھے ایک زخمی شیر کو چھوڑا ہے وہ شیر تین ٹکڑوں میں الگ الگ ٹرپ رہا ہے۔ صرف ہندوستانی مسلمانوں کی بات نہیں برصغیر کے ان تینوں زخمی حصوں کو کب اتنی عقل آئے گی کہ وہ آپس میں مل بیٹھ کر اپنے اپنے زخموں کا اندمال کریں گے۔

بات صرف بابری مسجد پر ختم نہیں ہوتی یہ صرف اپنے آپ کو تسلی دینے کی باتیں خاں صاحب محترم بابری مسجد ٹریسٹڈی کے روشن پہلو پر زور دینے اور مسلمانوں کو خوش فہمی میں ڈالنے کی جدوجہد کرنے کے بجائے اپنے رفیقوں (آر ایس ایس والوں) کو وہ نکتے کی باتیں سمجھائیں۔

خاں صاحب نے بابری کمیشن کی رپورٹ کا مطالعہ کیا ہوگا، یہ رپورٹ (ایک پہلو کے لحاظ سے) نہایت مایوس کن ہے اور خاں صاحب کے روشن پہلو پر پانی پھرنے کے لئے کافی ہے۔

ترکی عالم دین کا اہم مشورہ

موجودہ بین الاقوامی جمہوری دور میں اقامت دین کا انداز بدلتا ہوگا، ورنہ اسلام کو نقصان پہنچے گا

ترکی کے ایک بزرگ شیخ سید محمد ناظم کے خیالات جن سے پورے طور پر اتفاق تو شاید نہ کیا جاسکے تاہم اس میں ہمارے لئے غور و فکر کا سامان موجود ہے!

پڑوسی ملک پاکستان میں مذہبی اور تہذیبی تشدد پسندی کے تباہ کن نتائج سامنے آرہے ہیں اور یہ چھوٹا سا کمزور ملک سخت ترین حالات سے گزر رہا ہے۔

پاکستان کا ایک دور اندیش اور مخلص طبقہ انتہا پسندی کے اثرات سے

تنگ آکر اس جذبہ سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس سلسلہ میں پاکستان کے ایک اخباری ادارہ کی مجلس نے ایک مشہور ترکی عالم اور شیخ طریقت شیخ سید محمد ناظم العادل الحقانی القبر صی نقشبندی کو اسلام کے مستقبل پر اظہار خیال کی دعوت دی اور موصوف نے دنیا میں تبلیغ اسلام خاص طور پر یورپ میں اسلام کی اشاعت کے طریقہ کار پر نہایت دانشمندانہ تقریر کی۔

یہ تقریر خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کو وہ راہ عمل دکھاتی ہے جو انہیں قرآن کریم اور اسوۂ رسول علیہ السلام کے ذریعہ دکھائی گئی ہے ہم ذیل میں وہ تقریر اور اس پر ایک پاکستانی اہل قلم نے جو تبصرہ کیا ہے اسے ندائے خلافت ۱۹ جنوری ۱۹۹۳ء لاہور سے نقل کر رہے ہیں۔

آج مسلمانان ہند اپنے آپ کو جس اندھیرے میں محسوس کر رہے ہیں وہ موقع پرست لیڈروں کی اندھا دھند پیروی کا نتیجہ ہے۔

مذہبی قائدین جو دنیوی مفادات کے مقابلہ میں آخرت کی باز پرس سے ڈرتے ہیں ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی ہے۔

اور یہ موقع پرست لیڈر مختلف سیاسی شعبہ بازریوں کے ذریعہ مسلم عوام کو مذہب کی رہنمائی کی طرف جانے سے روکتے ہیں۔

بظاہر حالات میں ہمارا ماحول نقار خانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایک فرض ہے جس کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے۔ غور کیجئے :

سید محمد ناظم العادل کا فرمانا ہے کہ مسلمانوں کے اعمال دیکھ کر لوگ اسلام سے بھاگ رہے ہیں۔ یورپی لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کا اسلام کہاں ہے؟ دنیا کا کوئی ایسا حصہ بتائیے جہاں اسلام کی برکتیں دیکھی جاسکتی ہوں ورنہ خود مسلمانوں کو ہم دیکھتے ہیں تو ان سے ہم ہی اچھی حالت میں ہیں۔ ترک بزرگ نے دوسری بات یہ کہی کہ یورپ

میں تبلیغ کا نام ہی نام ہے، شتر بے مہار کی طرح لوگ ٹھکتے ہیں اور نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔ کروڑوں روپے کی امداد سے اسلامی سنٹر چل رہے ہیں لیکن وہ اسلام کی بجائے مختلف مسلمان ملکوں ————— کے سیاسی مفاد کے لئے کام کرتے ہیں۔ جو لوگ اور ادارے نیک نیتی سے تبلیغ کرتے ہیں، وہ بھی تبلیغ کا صحیح طریقہ نہیں جانتے۔ اسلام برداشت، تحمل اور رواداری کا سبق دیتا ہے اس کی تعلیم ہے کہ دین کو احسن طریقے سے پیش کرو مگر ہمارا رویہ اس سے بالکل ہٹ کر ہے۔ ایک بات اور انہوں نے یہ کہی کہ مغرب کو آپ دماغ کے راستے دین پر نہیں لاسکتے عقل میں وہ آپ سے کہیں زیادہ ہیں اس لئے قلب سے اپیل کرنی ہوگی اور یہ صوفیانہ طریقے سے ممکن ہے مگر پاکستان کی تبلیغی تنظیمیں تھوٹ سے ناواقف ہیں۔

اس تقریر پر ایک پاکستانی صاحب قلم نے جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی ہماری توجہ کا مستحق ہے۔

اور اس تبصرہ میں مذہبی، لسانی اور تہذیبی و سیاسی تشدد پسندی سے پیدا شدہ بدترین حالات کا احساس نمایاں ہے۔

”یہاں پھر ہمیں دو نقطہ نظر ملتے ہیں، ایک یہ ہے کہ ہمیں مغرب سے لڑنا ہوگا، ہندو و یہود سے تصادم مول لینا ہوگا اور اس میں فتح مند بن کر ابھریں گے تو اسلام کا جہاں وسعت پذیر ہو سکے گا ورنہ وہ ہمیں نوالہ بنالیں گے، ہمارا وجود بھی نہیں رہے گا اس لئے معرکہ آرائی کے طبل بجا دو، فیصلہ کن تصادم کے لئے لشکر آرائی کرو اور سر بھیلی پر رکھ کر جنگ و جہاد کے علم لہراؤ۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں رہ گیا ہے۔“

جب کہ دوسرا نقطہ نظریہ ہے کہ مومن کی اصل لڑائی بے تیغ لڑائی ہے، اس میں وہ قلوب اور اذہان کو فتح کرتا ہے، قومی، نسل، علاقائی عصبیتوں کی دیواروں کو گراتا ہے اور ان دیواروں کو گرانا ہی اصل مسئلہ ہے۔ مغرب میں پہلے پادریوں

نے اسلام کے خلاف ایک دیوار عصیت کھڑی کی، پھر موجودہ مادہ پرستانہ مغربی تہذیب نے ان دیواروں کو اور اونچا کیا اور مسلمانوں کے متعلق مغربی معاشرہ میں ایک خراب تاثر کو عام کیا گیا ہے۔ یہ خراب تاثر قائم کرنے میں ہم نے بھی مغرب کے اسلام دشمنوں کی مدد کی ہے اس لئے پہلے رابطہ قائم کیا جائے، غلط تاثر کو دور کرنے کا کوئی بندوبست ہو اور اہل اسلام کو ان سے متعارف کرایا جائے۔ محض جوش جہاد یا بے جا تفاخر کا شکار ہو کر بھڑ جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور دنیا میں مسلمانوں کی ہر جگہ کوشش ہونی چاہئے کہ وہ نسلی و قومی جنگ کے حالات کو ختم کر کے ایسی فضا بنانے کی کوشش کریں جس میں دوسری قوموں اور ملتوں سے ڈائیلاگ ہو سکے اور مجادلہ کی بجائے مذاکرہ ہو تاکہ اسلام کو صحیح صحیح ان تک پہنچایا جائے ورنہ نسلی اور قومی جنگوں کی آگ انہیں بھی بھسم کر دے گی اور اسلامی دعوت کے امکانات کو بھی۔

یہ دونوں نقطہ نظر وزن رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی قومی اور وطنی حیثیت بھی ہیں، ان حیثیتوں میں ان کا دوسری قوموں اور اوطان سے ٹکراؤ ہے اور ہر ٹکراؤ کے لئے بھی تیاری ناگزیر ہے لیکن ٹکراؤ کو ٹالنے کا فن بھی آنا چاہئے اور ہمیں دنیا کی سب قوموں سے زیادہ اس کے لئے کوشاں ہونا چاہئے کہ دنیا لڑائی بھڑائی کی نہیل، افہام و تفہیم کی دنیا ہو اور بات سمجھنے کی فضا عام ہو۔

سب سے بڑے مخالف ہندوستان کو بھی دیکھنا چاہئے کہ عام ہندو تک اسلامی پیغام کی رسائی کیسے ہو سکتی ہے اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ قومی عداوت کا موجودہ ماحول ختم کر کے ایک نئی فضا بنائی جائے کہ وہ مطالعہ اسلام کرے اور حق کے لئے اس کے سینے میں کشادگی پیدا ہو۔

ہم یورپ میں تبلیغ کی باتیں کرتے ہیں وہاں بھی تبلیغ ضرور ہونی چاہئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آخرت میں ہم مسلمانوں سے یورپ سے زیادہ اس برعظیم کے بارے میں پوچھ ہوگی کہ سنیکڑوں سال وہاں رہنے بسنے کے بعد اسلام کے

پیغام کو دلوں میں اتارنے کے لئے کیا کچھ کیا گیا؟

ترک عالم دین اور بزرگ نے تصوف کی بات بھی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ تصوف کے خلاف ہیں ان کے دلوں میں بغض، حسد اور سختی ہے، جبکہ تصوف کی ضرورت اس لئے ہے کہ ہم لوگوں کو دماغ کے راستے دین پر نہیں لاسکتے۔ اس کے لئے ان کے قلب کو متاثر اور مسح کرنا ہوگا۔

تبصرہ نگار نے آخر میں اسلامی جہاد کے نام پر برپا ہونے والی مختلف تحریکوں سے تعلق رکھنے والی دہشت گردی کی مذمت کرتے ہوئے لکھا:

ایک بڑا مسئلہ مسلمانوں کی مختلف قومی جنگوں کا ہے جو کشمیر سے لے کر فلسطین تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان جنگوں سے دست برداری اختیار نہیں کی جاسکتی مگر مسلمان آزاد نہیں ہیں کہ وہ یہ جنگ جس طرح چاہیں لڑیں۔ انہیں ہر جگہ اپنی جنگ کو اسلامی ضابطہ اور اخلاق کے مطابق رکھنا ہوگا۔ ایسی دہشت گردی جس میں معصوم لوگ نشانہ بنیں یا راہ چلتے پر حملے ہوں کسی طرح جائز نہیں ہے اور مغرب کی کوشش یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرے۔ ہمیں یہ الزام خواہ مخواہ اپنے آپ پر اوڑھ کر اپنے لئے اور اسلام کیلئے نیا رکاوٹ اور مصیبت نہیں کھڑی کرنی چاہئے۔

تبصرہ نگار نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر آلسو بہاتے ہوئے انہیں اس کی طرف متوجہ کیا اور لکھا:

مسلمانوں کی حیثیت ان بگڑے ہوئے مسلمانوں کی ہے جن کو یہود و نصاریٰ کہا گیا۔ ان کے پاس حق تھا، کتاب تھی لیکن وہ ان کے کسی کام نہیں آئی اور بحیثیت جموعی یہ ضال اور منصوب علیہم گروہ قرار پائے۔ یہی حال موجودہ مسلمانوں کا ہے، ان سے کوئی توقع رکھنا بے کار ہے۔ سابقہ یہود و نصاریٰ کی ایک بڑائی ان میں موجود ہے، یہ اپنے آپ کو حق کا اجارہ دار سمجھتے ہیں اور اترتے پھرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ خدا کی محبوب قوم ہیں اور خدا لازمی طور پر

مترکہ میں ان کا مددگار ہو گا۔ یہ اپنے مفادات کے لئے کتمان حق کرتے ہیں، ان کے اجبار و رعبان ان کے جھوٹے خدا ہیں اور انہیں عذاب کے راستے پر لے جاتے ہیں۔ ان کے امرار خود غرضی و ہوس میں ڈوب گئے ہیں جو قومی رہنمائی کی بجائے قوم کو مزید بد راہ کرتے ہیں۔ خود عوام الناس کا یہ حال ہے کہ توہمات ان کا مذہب، تفرقہ ان کی سیاست اور خراب و خستہ ان کی معیشت ہے لیکن وہ اس حال میں ہی مست ہیں۔ کوئی جوہران میں موجود نہیں۔ یہ تاریخ کا فہم نہیں جس سے بس بد لوٹھے گی۔ یہ دین و دنیا دونوں برباد کر چکے ہیں۔ مذہب کے نام پر ایک منافقت چل رہی ہے۔ ورنہ حقیقی مذہبی رُوح ان میں کہیں نہیں۔ اس لئے ان سے کوئی توقع ہی بیکار ہے اور کوشش اس بات کی کرنی چاہئے کہ امت مسلمہ میں کہیں سے کوئی نیا خون شامل ہو۔

اس نئے خون سے نیا ابھار پیدا ہو گا پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے کہ عرب بے کار ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ترکوں کے ہاتھ میں اسلام کا جھنڈا دیا۔ ہندی اور افغانی مشرف بہ اسلام ہو گئے اور نئی نئی قومیں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں جس سے جو دلوٹا، نیا منظر پیدا ہوا اور اب بھی کسی نئے منظر کے لئے کسی نئی قوم کو اسلامی سچائیوں کا امین بن کر اٹھنا چاہئے۔ ورنہ موجودہ مسلمانوں پر اٹھا رکھا گیا تو یہ وہ درخت ہے جو سوکھ گیا ہے اور اس پر پھل آنے کے کوئی آثار نہیں۔

تبصرہ نگار جس درجہ مسلمانوں کی زبوں حالی پر ناامیدی کا اظہار کر رہے ہیں ہم اس سے اتفاق نہیں کر سکتے۔

مادہ پرستی کے موجودہ طوفانی دور میں مسلمانوں کی ایک معتد بہ

اور اچھی خاصی تعداد دین و اخلاق سے وابستگی رکھتی ہے۔

اور یہ اسلام کی زندہ کرامت ہے کوئی دوسری قوم ہوتی تو وہ مادہ

پرستی کی سرپرستی میں برباد ہونے والے طوفانِ بے دینی اور الحاد میں

فرق ہو چکی ہوتی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہبی قائدین ہمت سے اٹھیں اور اخلاص اور ایثار اور لذات نفسانی اور خاندان پروری کے نامبارک جذبات سے کنارہ کر کے مسلمانوں کو صحیح راہ دکھائیں۔
یہ وہ درس ہے جو ہم سب کے مذہبی قائدین اپنے مواعظ حسنہ اور کتابوں کے ذریعہ ہمیں دیتے ہیں۔

(نندائے خلافت لاہور ۱۹ تا ۲۵ جنوری ۱۹۹۳ء)

فوائد الفوائد کا علمی مقام

از مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی
حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کے مستند ملفوظات
فوائد الفوائد کی پیشیت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے الفاظ میں مشائخ چشت کے
دستور العمل کی ہے۔
حضرت شیخ کے یہ ملفوظات (۱۸۸) مجلسوں پر مشتمل ہیں جن میں شریعت، طریقت،
عبادت و اخلاق اور معاملات کے تمام گوشوں پر قرآن و حدیث اور فقہ و کلام کی روشنی
میں نہایت مدلل اور ساتھ ہی نہایت دالہانہ اور دل گداز انداز اور فارسی زبان کے اعلیٰ
ادبی اسلوب بیان میں بحث کی گئی ہے۔
پھر ساتھ ہی مولانا اخلاق حسین قاسمی کی دل کش دہلوی اردو کے تشریحی مباحث
نے اس اہم کتاب کو علم و ادب اور تحقیق و تفکر کی ایک بلند پایہ کتاب بنا دیا ہے۔

زیر طبع ہے

ادارہ رحمت عالم، شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں، دہلی

جو رسول بنایا گیا ہے وہ بے مسئلہ نہیں بن سکتا

حفیظ جالندھری نے تو یہ بات طنز کے طور پر کہی تھی کہ میں تنزل کی حد دیکھنا چاہتا ہوں شاید ترقی کا زینہ نظر آجائے اور یہ بھی تصوف کا نکتہ ہے کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے لیکن سنجیدہ بات تو قرآن پاک کی ہے کہ ساری امتیں صرف شخصی اور قومی نجات کا پیغام دیتی رہیں اور آخری امت کو اس لئے کھڑا کیا گیا کہ وہ سب سے ادھر اٹھ کر اپنے مسئلہ کے ساتھ ساتھ اپنی تمام انسانی برادری کے مسائل کا بوجھ بھی اٹھائے۔

تو دراصل مسلمانوں کی پریشانیوں کا سبب یہ ہے کہ وہ خود غرض بن کر رہ گیا ہے اگر وہ اپنے منصب کے مطابق سب کی بھلائی اور سب کا بھلا چاہتا تو خدا کی رحمت کا ہاتھ اس کے سر پر ہوتا۔

اقبال نے فکر کے طور پر نہیں بلکہ ذمہ داری کا احساس دلانے کے لئے کہا ہے کہ میری ہستی سارے عالم کی عریانی اور ننگے پن کے لئے پہلا من اور پوشش ہے میں اگر مٹ گیا تو سارے عالم کی رسوائی اور بدنامی ہوگی۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب موجودہ عہد ابتلا اور عہد فتن میں مسلمانوں کی جذباتیت سے نا جائز فائدہ اٹھانے والے مسلم رہنماؤں کی تباہ کن سے کارروائیوں سے بے حد پریشان ہو کر جو اجتہادی باتیں کرتے ہیں ان میں سے

بعض باتیں نہ صرف دین فطرت (اسلام) کے خلاف ہوتی ہیں بلکہ موجودہ جمہوری تقاضوں کے بھی مطابق نہیں ہوتیں۔

موصوف نے اپنے پرانے فلسفہ (پیردگی) کو دوسرے عنوان سے پیش کیا ہے اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ہندوستان میں بے مسئلہ ہو کر رہیں پھر وہ دیکھیں گے کہ وہ تمام پریشانیوں سے نجات پا گئے۔ یہ اجتہاد اگر دین فطرت کے مطابق ہوتا تو اس پر عمل کر کے مسلمان ہر قسم کی مشکلات پر قابو پا لیتے لیکن قرآن و سنت اور جمہوریت دونوں میں اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

غلط قیاس

خاں صاحب نے مسلم ملکوں کی مثال دی ہے کہ مسلمان ان دولت مند ملکوں میں جس طرح بے مسئلہ ہو کر رہتے ہیں اسی طرح ہندوستان میں ہیں لیکن فقہی اصول کے مطابق یہ قیاس مع الفارق کہلاتا ہے، یعنی مسلم ملکوں کی جو صورت حال ہے وہ ہندوستان کی صورت حال سے مختلف ہے دولت مند ملکوں میں مسلمان رہنما ہو یا مزدور و ملازم ہو وہ بے مسئلہ ہو کر رہتا ہے کیونکہ وہاں وہ سائل ہے اور سائل اگر بے مسئلہ ہو کر کھڑا نہ ہو (سوائے سوال کے) تو وہ محروم رہتا ہے۔

دوسری وجہ فرق کی یہ ہے کہ باہر کے ملکوں میں مسلمان ایک پردیسی ہے اور پردیسی بھی ایسا کہ اسے وہاں ستھری کی دکان لگا کر سودا بیچنے کی بھی اجازت نہیں جب تک وہ کسی معلم کو اس تجارت کا اصلی مالک نہ دکھائے۔

ہندوستان میں وہ اپنے ملک کا شہری ہے، اپنے گھر بار کا مالک ہے وہ اپنے وطن میں داخل ہوتے ہی عزت و آزادی کا سانس لیتا ہے۔

اپنے گھر میں مسلمانوں کا بے مسئلہ ہو کر رہنا ممکن نہیں ہے سوائے
اس کے کہ وہ جتنے جی موت کے گڑھے میں جا سوتے ہیں۔

شریعت انہیں جو حکم دیتی ہے وہ یہ ہے:

”کَلِمَةُ رَاعٍ وَكَلِمَةُ مَسْئُولٍ عَنْ رِعِيَّتِهِ“ (حدیث مشہور) مسلمانو! تم سب محافظ و نگراں ہو اور ہر محافظ جواب دہ ہے اس مخلوق کے بارے میں جو اس کی حفاظت میں دی گئی ہے۔ عربی میں رعیا اور رعیت کے معنی ہیں حفظ الغير لمصلحتہ (المبجذ) کسی دوسرے کی حفاظت کرنا اس کی مصلحت اور ضرورت کے مطابق۔

اس بلیغ اور جامع کلام نبوت کے مطابق ہر مسلمان اپنے اپنے دائرہ کار اور حلقہ احباب کے مطابق اپنی ذات کے بارے میں، اپنے بال بچوں کے بارے میں اگر وہ چودھری اور ممبر ہے تو اپنے اپنے زیر اثر لوگوں کے بارے میں اور اگر حاکم ملک ہے تو پورے ملک کے بارے میں اپنے صیغہ کے سامنے تائین کے سامنے اور مرنے کے بعد خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

مسئولیت کے دائرہ کی وسعت

اسلام نے مسلمان کی مسئولیت اور جواب دہی کے دائرہ کو اتنا وسیع کر دیا ہے کہ اس میں ہر قسم کے انسانوں (مسلموں اور غیر مسلموں) کے علاوہ حیوانات بھی شامل ہیں۔

احادیث میں آتا ہے کہ ایک کتے کو پانی پلانے پر ایک بازاری عورت کو جنت میں داخل کر دیا گیا اور ایک بلی کی مالک خاتون کو اپنی پالتو بلی کے پیاسا مارنے پر دوزخ میں ڈال دیا گیا۔ (مشکوٰۃ ۱۶۸)

رسول پاک کا واقعہ ہے کہ ایک اونٹ آپ کو دیکھ کر چیخنے لگا، آپ نے اس کی کمر ہاتھ پھیرا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے

آپ نے اس کے مالک سے فرمایا یہ تیرا اونٹ شکایت کر رہا ہے کہ تو اس سے محنت زیادہ لیتا ہے اور چارہ کم کھلاتا ہے۔ یہ نبوت کا معجزہ تھا اور امت کے لئے سبق تھا۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز تشریف لے جا رہے کہ ایک بھوکا کتا آپ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا، آپ نے اپنے تھیلے میں سے کتیب (کتف شاة) کا گوشت نکال کر اس کے آگے ڈال دیا اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔
 لِقَوْلُونِ اِنَّهُ الْمَحْزُومُ (حکایات ۱۹) قرآن جانے والے یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے لفظ محزوم (بے سہارا) کا مصداق یہ بھی ہے

مسلم مسائل کیا ہیں؟

مسلمانوں کے مسائل میں جن مسائل کا ہمارے ہمدردوں کے دماغ پر بوجھ ہے یہ وہ مذہبی مسائل (مسجد و مقابر، نکاح و طلاق وغیرہ) ہیں جن میں جذباتی مسلم قیادت مسلمانوں کا استحصال کرتی ہے اور یہ استحصال دردمندانِ ملت کو بے حد پریشان کرتا ہے اور وہ بے چین ہو کر مسلمانوں کو بے مسئلہ بن کر رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

ان مذہبی مسائل کے علاوہ مسلمانوں کے شہری، معاشی، تجارتی اور زراعتی مسائل ہیں۔ ان مسائل کو مسلمان اپنے ہندو، سکھ، عیسائی بھائیوں کے ساتھ مل جل کر حل کرتے ہیں۔ ان شہری مسائل میں مشترک یونینیں ہیں، مشترک انجمنیں ہیں، مشترک بورڈ ہیں۔ ان مسائل میں مشترک احتجاج ہوتا ہے، جلوس نکلتے ہیں، پولیس کی گولیاں چلتی ہیں، ہندو، مسلمان، سکھ سب مل کر زخمی ہوتے ہیں اور بارے جاتے ہیں اور اس ظلم و زیادتی پر کسی فرقہ کے قائد کو یہ کہتے نہیں سنا گیا کہ ہمارے حکومت ہمارے فرقہ مسلمانوں یا ہندوؤں پر ظلم کر رہی ہے۔

ان مسائل کی طرف سے نہ کسی ہمدر دلت کو کوئی فکر ہے اور نہ ان کی طرف سے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ مسلمان تجارت اور معیشت کے مسائل سے بے مسئلہ بن کر رہیں اور نہ دیا جاسکتا ہے۔

یہ جمہوری اتحاد کا وہ نقشہ ہے جس کی ضرورت کی طرف مولانا آزاد نے لکھنؤ کانفرنس میں توجہ دلائی تھی اور جو ایک جمہوری ملک میں بہر حال قائم ہوتا ہے۔ پریشانی ہے تو مذہبی مسائل میں ہے اور ان مذہبی مسائل میں اگر مسلمان شریعت کے دو بنیادی اصولوں کو سمجھ لیں تو اس میدان کی مشکلات بھی ختم ہو سکتی ہیں اور مسلمانوں کو اپنی سنجیدہ مذہبی قیادت کی رہنمائی میں (جو کہ الحمد للہ موجود ہے) ان مسائل پر قابو پانے کا موقع مل سکتا ہے۔

اور ان دونوں بنیادی اصولوں کا حاصل یہ ہے کہ حق طلبی میں تشدد کی راہ اختیار نہ کی جائے جب تک جمہوری حکومت بنیادی دستور (معاہدہ صلح) کے مطابق فیصلہ کرنے کی اپنے آپ کو پابند قرار دے اور آئین کے دئے ہوئے حقوق سے انکاری نہ ہو۔

اور مذہبی مسائل (کفر و اسلام) میں حق و ناحق کے فیصلہ میں سنجیدہ افہام و تفہیم اور استدلال کی راہ سے تجاوز نہ کیا جائے اور خدا تعالیٰ کے اس تقدیری اعلان کو بھی ذہن میں رکھا جائے۔

اے بنی! آپ کا پروردگار چاہے تو تمام اہل زمین کو ایمان پر جمع کر دے (یولس ۹۹) لیکن خدا کی مصلحت عام اس کو پسند نہیں کرتی۔

جمہوریت کا تقاضا

پرانی دنیا میں مذہبی لوگ رہبانیت اور گوشہ نشینی اختیار کر لیتے تھے لیکن یہ دور جمہوریت ہے اس میں گوشہ نشینوں کو بھی میدان میں نکلنا پڑتا ہے اور بعض دفعہ جمہوری تقاضا اصلاح حال کے لئے ان

گوشت نشینوں کو میدان میں لاتا ہے۔

اسلام کی صداقت اور نادیت کا جو ہر اسی میدان و معاشرہ میں
کھلتا ہے جہاں وہ اپنے روحانی پیشواؤں کو، مدرسوں کے اہل علم و عمل کو، صوفیاء
و مشائخ کو تقویٰ و طہارت سے پوری طرح آراستہ ہونے کے باوجود
خلق خدا کو خدا کا کنبہ (عیال اللہ) سمجھ کر ان کی بے غرض خدمت کے لئے سرگرم
عمل رکھتا ہے، یہ منہ علیحدگی پسندی، مذہبی اور قومی غرور کے ساتھ
جاری نہیں رہ سکتا۔

اس معاملے پر مولانا جلال الدین رومی نے بڑے روحانی انداز سے
روشنی ڈالی ہے اور ایک درویش کی حکایت کے حوالے سے بتایا ہے کہ
اس نے ایک حلوہ فردش بچہ سے حلوہ خریدا اور اسے قیمت نہیں دی،
وہ بچہ رونے لگا۔ لوگوں نے کہا کہ اس درویش کے پاس اگر
پیسے نہیں تھے تو اس نے اس معصوم بچے سے سودا کیوں خریدا۔
اتنے میں غیب سے مدد آگئی اور درویش نے بچہ کو حلوہ کی قیمت
دیدی، پھر اس درویش نے کہا میں نے بچہ کو اس لئے لایا کہ خدا کی
رحمت کو جوش میں لاؤں۔

تاناگرید کو دک حلوہ فروش

بحر بخشش و اتمی آید بجوش

ملک کے کمزور طبقے اگر آواز بلند نہ کریں تو ایک جمہوری حکومت

کے لئے طاقتور ہاتھوں کو زیادتی سے روکنا مشکل ہو جائے۔

ایسے حالات میں حضرت خاں صاحب پندرہ بیس کروڑ انسانوں کو اچھوٹوں

کے ساتھ شامل کر کے ہندوستان کے سیکولر نظام کا دنیا کے سامنے

منہ کالا کرنا چاہتے ہیں ؟